شمارہ : ۱۷

دینی، علمی، تحقیقی، تاریخی اور سوانحاتی مجلہ

سہ ماہی

احوال و آثار

جنوری۔ فروری۔ مارچ
۲۰۰۸ء

مرتب

نور الحسن راشد کاندھلوی

حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی
مولویان کاندھلہ، ضلع مظفر نگر (یو۔ پی) انڈیا ۲۴۷۷۷۵، فون۔ ۲۲۲۹۱۳۔۰۱۳۹۲

ایک اہم دینی علمی تاریخی دستاویزی پیش کش

قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

احوال و آثار و باقیات و متعلقات

مرتب: ـــــــــــ نور الحسن راشد کاندھلوی

جس کے اکثر مشتملات و مندرجات حضرت مولانا نانوتوی کے متعلق معلوم اطلاعات پر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس میں:

تذکرہ حضرت مولانا محمد قاسم تالیف مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی سب سے پہلی طباعت پر مبنی مکمل اور صحیح ترین نسخہ، ذیلی عنوانات اور مقدمہ اور مفصل حواشی اور توضیحات کے ساتھ شامل ہے۔

درج ذیل کتابیں پہلی بار اس مجموعہ میں چھپی ہیں۔

(۱) مکتوبات حضرت مولانا محمد قاسم بنام حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکیؒ کا فارسی مکمل متن، اردو ترجمہ اور مفصل حاشیے۔

(۲) سفر رڑکی کے موقع پر سوامی دیانند سرسوتی سے طویل خط و کتابت، مرتب کے مفصل مقدمہ اور متعلقات کے ساتھ

(۳) مکتوبات قاسمی کے ایک غیر مطبوعہ اور نادر ترین قلمی نسخہ کا مکمل عکس، اور اس کا مفصل تعارف اور ضمیمہ بھی شامل ہے۔

(۴) حضرت مولانا کی چند غیر مطبوعہ اور نادر ترین تصنیفات و تحریرات خود حضرت مولانا کے قلم سے۔

(۵) حضرت مولانا کے جملہ خطوط اور مکتوبات کے مضامین و مندرجات اور مکتوب الیہ اصحاب کا مفصل اشاریہ

(۶) حضرت مولانا کی تمام تصانیف کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں، ان کی شرحوں ترجموں اور حاشیوں کی مفصل فہرست (اشاریہ) شامل ہے۔

اعلیٰ درجہ کی کتابت و طباعت، عمدہ کاغذ، خوبصورت دلکش جلد۔ پونے آٹھ سو صفحات۔ عام قیمت صرف تین سو روپے -/۳۰۰، محصول ڈاک علیحدہ۔

حضرت مفتی الٰہی بخش اکیڈمی

مولویان کاندھلہ، ضلع مظفر نگر (یوپی) انڈیا ۲۴۷۷۷۵

مجلّہ

احوال و آثار

کاندھلہ

[سلسلۂ جدید] جلد نمبر:۱ شمارہ نمبر:۳

محرم، صفر، ربیع الاول ۱۴۲۹ھ جنوری، فروری، مارچ ۲۰۰۸ء

مرتب

نورالحسن راشد کاندھلوی

زر تعاون

ہندوستان میں	فی شمارہ	سالانہ
افراد سے	پینتیس روپئے	ایک سوتیں روپئے
لائبریریوں سے	پینتالیس روپئے	ایک سواسی روپئے
بیرونی ممالک کے لئے	سادہ ڈاک سے.	تیں امریکی ڈالر

دفتر سہ ماہی احوال و آثار

حضرت مفتی الٰهی بخش اکیڈمی

مولویان کاندھلہ، ضلع مظفر نگر (یوپی) انڈیا ۲۴۷۷۷۵

QUARTERLY AHWAL-O-AASAR
Mufti Ilahi Bakhsh Academy, Maulviyan, KANDHLA
Distt. Muzaffar Nagar (U.P) INDIA
Pin.247775 PH. 01392-222913 Mb.09358667219

کمپوزنگ سلیمانیہ کمپیوٹرس: (شہاب الدین بستوی) عیدگاہ کاندھلہ

فہرست مضامین

[متنازعہ معاملات میں کیرانہ ضلع مظفرنگر کی عدالت ہی سماعت کی مجاز ہے]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداریہ

دل زخم زخم لوگو، کوئی ہے جسے دکھائیں

نورالحسن راشد کاندھلوی

خدایا خیر! معلوم نہیں کیا ہو کر رہے گا، گذشتہ چند برسوں سے حوادث کی رفتار اس قدر تیز ہے، اہل فضل وکمال اور ارباب معرفت دنیا سے اس کثرت سے رخصت ہو رہے ہیں، جیسے حوادث کی زنجیر ٹوٹ گئی ہو اور ایک کے بعد ایک، اس کی کڑیاں کھلتی الگ ہوتی جا رہی ہوں، ایک عالم ایک صاحب کمال، زینت مسند ارشاد یا مصنف ومعلم کے حادثۂ وفات کی خبر اور اس کا صدمہ دلوں پر تازہ ہوتا ہے، اسی طرح کے اس المیہ سے نجات نہیں ملتی کہ کسی اور شخص کی رحلت کی خبر آجاتی ہے، ایک اور فاضل وصاحب کمال کی وفات دلوں کا آزردہ کر دیتی ہے، ان حوادث کی وجہ سے برصغیر کی دینی علمی مجلسیں وقف الم بنی ہوئی ہیں، کس کس کا تذکرہ کیا جائے۔

گذشتہ سالوں مہینوں میں کیسے کیسے اہل علم ارباب کمال رخصت ہو گئے، کیسے کیسے بافیض مشائخ وعلماء دنیا کو خیرباد کہہ گئے، علم کی کس قدر مسندیں خالی ہو گئیں اور معرفت کے کیسے کیسے زمزمے خاموش ہو گئے۔ یہ غم ایک فرد کا غم نہیں، یہ ایک شخص کی موت نہیں، ایک کامل کی وفات نہیں، ایک عالم کا حادثہ ہے، پوری ملت کا المیہ ہے، کیوں کہ اب جو بھی جا رہا ہے، رخصت ہو رہا ہے، اس کے جانے بعد وہ مسند اور وہ دائرہ علم وعمل، جہاں سے ان کے فضل وکمال اور تربیت وصحبت کی سوغات بٹتی تھی سونا نظر آتا ہے، بہت کم ایسا ہو رہا ہے کہ بڑوں کے جانے کے بعد ان کے جگہ لینے والے، ان کے کام کو سنبھالنے والے اور ان کے جلائے ہوئے چراغوں کی لو بڑھانے والے افراد موجود ہوں۔ جب حالات ایسے نامساعد اور آفات کی گرہ ایسی سخت ہو، اس وقت ایسے کسی ایک فرد کا

گزر جانا بھی قیامت سے کم نہیں، لیکن کیا کیا جائے کہ یہ عالم کا ایک ایسا ناقابل ترمیم وتغیر دستور ہے جس پر نہ کسی کی آہ وبکاء اثر انداز ہوتی ہے، نہ کسی کی تمنا اور ظاہری کوشش، جس کا وقت مقرر آگیا اس کو جانا ہی جانا ہے، یہی کہا جاسکتا ہے اور یہی کہنا بھی چاہئے۔ لِلّٰہ ما اعطیٰ ولہ ما اخذ و کل عند باجل مسمی ، فلتصبر و التحتسب!

اس سال کے پہلے تین مہینوں میں ہندوپاکستان کے تین بڑے اہل علم وکمال سفر آخرت پر روانہ ہوئے، سب سے پہلے یک شنبہ ۲۴؍محرم الحرام ۱۴۲۹ھ/۳؍فروری ۲۰۰۸ء کو، یہ نہایت افسوس ناک خبر آئی کہ برصغیر ہند کے مؤقر علمی ادارہ، دارالمصنفین کے سربراہ اور ناظم اعلیٰ مولانا ضیاء الدین اصلاحی ایک حادثہ میں زخمی ہوکر، سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔ یہ خبر بالکل تازہ تھی مولانا اصلاحی کی وفات سے ہندوستان کے علمی تصنیفی حلقوں کو اور دارالمصنفین اور دائرۃ الاصلاح کو خصوصاً جو گہرا صدمہ ہوا اور غیر معمولی نقصان پہنچا، زبان وقلم اس کے ماتم کے لئے وقف تھے کہ دو دو روز بعد ہی ۲۶؍محرم الحرام ۵؍فروری سہ شنبہ کی صبح، حضرت سید شاہ نفیس الحسینی کی رحلت کی خبر آگئی، یہی دو حادثے کیا کم تھے کہ ۲۰؍ربیع الثانی /۲۶؍اپریل ۲۰۰۸ء کو، ہندوستان کے نامور عالم، استاذ حدیث، مصنف اور شیوہ بیان مقرر، مولانا انظر شاہ کشمیری بھی ایک لمبی بیماری کے بعد داغ مفارقت دے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تینوں ہی حضرات اپنے اپنے میدان میں ممتاز اور خاص انفرادیت وصلاحیتوں سے مالا مال تھے، تینوں سے علم وکمال کی دنیا کو تابندگی، فضل وکمال کو جلا اور علمی تعلیمی تصنیفی اصلاحی تربیتی خدمت کرنے والوں کو بڑا سہارا تھا۔ تینوں ہی حضرات علمی دنیا کے بڑے رہنما اور معلم ومربی تھے، اگرچہ ان میں سے ہر اک کا ایک خاص میدان تھا لیکن تینوں کا بحیثیت مجموعی افادہ عام تھا، مولانا اصلاحی صاحب کی تصانیف وتحریرات اور تحقیقات ومباحث اہل ذوق کو غذا بخشتے تھے، مولانا انظر شاہ کشمیری تصانیف وتراجم کے علاوہ، درس وتقریر کی دنیا میں بھی ممتاز ومعروف اور نہایت سربلند تھے، مولانا کے درس سے سینکڑوں ہزاروں اصحاب نے استفادہ کیا، مولانا کی تقریروں کا زمزمہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ اور دنیا کے متعدد ملکوں میں جاری رہا، مولانا کے اسلوب بیان کی انفرادیت، تعبیر مضامین اور بلاغتِ زبان کی لطافت سے سامعہ کو ایک کیف ملتا اور دماغوں کو ایک طراوت میسر آتی تھی۔

حضرت شاہ نفیس الحسینی صاحب اگرچہ بڑے عالم نہ تھے، نہ مصنف اور سحر بیاں مقرر مگر شاہ صاحب کی

شخصیت میں ایک موہنی تھی، ایسی جاذبیت وکشش، ایسی محبت ودلنوازی، ایسی علم نوازی کی خواور ایسی باہمہ وبے ہمہ ہونے کی صفت، جس کی مثالیں ہمارے زمانہ میں کم یاب ہیں۔ اس لئے ان کا جس قدر بھی صدمہ ہو کم ہے۔



مولانا اصلاحی نے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں تعلیم پائی، سنہ ۱۹۵۸ء میں دارالمصنفین سے وابستہ ہوئے، ممتاز مؤرخ مصنف جناب صباح الدین عبدالرحمان دسنوی کی وفات (۱۴۰۸ھ/نومبر ۱۹۸۷ء) کے بعد دارالمصنفین کے ناظم وسربراہ مقرر کیے گئے اور اس کے بعد سے اس مشعل کو، جس کی نگرانی ان کے سپرد کی گئی تھی، روشن رکھنے کی کوشش میں متواتر مصروف رہے اور بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

مولانا اصلاحی تصنیف وتحقیق کی ہمہ وقت مصروفیت، دارالمصنفین کی نگرانی وسرپرستی کے علاوہ، مجلّہ معارف کے مدیر بھی تھے۔ معارف جس شان کا رسالہ ہے، اس کا جو علمی معیار ہے اور علمی دنیا میں اس کی جو قدر ومنزلت ہے، اس کا باقی رکھنا آسان کام نہیں تھا مگر اصلاحی صاحب اس مشکل مرحلہ سے بھی خوبی کے ساتھ گزرے۔ اگرچہ ادھر معارف کی اشاعت بہت کم ہوگئی تھی مگر اس کی آن بان اک حد تک قائم رہی۔

مولانا اصلاحی صاحب کی متعدد عمدہ تصانیف ایک مدت تک اہل علم وذوق کو شادماں کرتی رہیں گی، معارف کے مضامین اور سیمیناروں میں پڑھے گئے مقالے بھی، کامیاب علمی سفر کی ایک قابل قدر یادگار کے طور پر باقی رہیں گے۔

مولانا دارالمصنفین کے علاوہ دائرۃ الاصلاح سرائے میر کے بھی سرپرست تھے، دائرۃ الاصلاح کے علمی مجلّہ کی ادارت فرماتے تھے، جس میں خصوصاً قرآن کریم اور تفسیری موضوعات پر مولانا کے عمدہ مضامین چھپتے رہتے تھے۔

مولانا سے متعدد سیمیناروں میں نیاز حاصل رہا، ہمیشہ شفقت وکرم کا معاملہ فرماتے تھے، اس طرح ملتے تھے کہ نیازمندوں کو شرمندگی ہوتی تھی، کئی مرتبہ خود آگے بڑھ کر اپنے چھوٹوں سے بے تکلف ملے۔

دارالمصنفین حاضری ہوئی تو مولانا نے خود زحمت فرما چل پھر کر پورا ادارہ دکھایا، لائبریری کی زیارت کرائی، مطبع اور قبرستان تک لے گئے، لائبریری سے استفادہ کی سہولت بخشی اور میری گذارش پر بعض مخطوطات کے فوٹو لینے کی اجازت دی۔ فہرست مخطوطات دیکھتے ہوئے ایک مخطوطہ کے تحت اندراج پر نگاہیں اٹک گئیں،

خیال ہوا کہ یہ کتاب ہمارے خاندانی کتب خانہ کی ہے، نکلوا کر دیکھی تو اس خیال کی تصدیق ہوئی۔(۱) بہر حال مولانا نے عنایات سے نوازا، اگر چہ اس کے بعد بھی مولانا سے سیمیناروں میں بعض مرتبہ اور نیاز حاصل ہوا، مگر یہ کیا خبر تھی کہ دار المصنفین کے سایہ میں یہی مولانا سے آخری ملاقات بھی ہے! وکان امر اللہ قدراً مقدوراً.

حضرت شاہ نفیس الحسینی صاحب اگر چہ نہ بڑے عالم تھے، نہ مصنف نہ شیوہ بیان مقرر، مگر اپنے گونا گوں کمالات، قدیم وجدید علمائے کرام اور برصغیر کی ملت اسلامیہ کی تاریخ کے مختلف گوشوں سے وسیع واقفیت، ان کی خدمات کارناموں اور علمی آثار سے دلی محبت وانسیت، اس موضوع پر برصغیر میں شائع کتابوں کی فراہمی، ان سے استفادہ کرنے اور ان کے مطالعہ کا اہتمام، خصوصاً تحریک سید احمد شہید اور اس کے علمی سیاسی گوشوں سے والہانہ تعلق، اس پر کتابوں کی تصنیف اور ان کی اشاعت کی جدوجہد، اس کے متعلق، نادر وغیر مطبوعہ مآخذ کی تلاش وجستجو، ان کی اشاعت کی تدبیر، نیز علمی دینی تحقیقی کام کرنے والوں کی معاونت وسرپرستی کے علاوہ، سلوک ومعرفت میں عالی مرتبہ رکھتے تھے، نیز ارشاد وتربیت، خلوص وتحمل، رواداری، اخلاق کی بلندی، اور ہر اک سے ایک خاص جذبۂ دلنوازی کے ساتھ ملاقات، ایسے اوصاف تھے جو کبھی نہیں بھلائے جاسکتے۔

شاہ نفیس میں جامعیت کی عجیب شان اور کیفیت تھی، ہر اک طبقہ کے، ہر اک سطح، ہر اک علم وذوق کے افراد کا شاہ صاحب سے گہرا رابطہ رہتا تھا، شاہ صاحب ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے اور اصلاح وتربیت اور حکم حق پہنچانے کے لئے خاص غیر محسوس انداز میں گفتگو کرتے، اپنی بات بھی کہہ دیتے تھے، اور مخاطب کے مزاج اور دل شکنی کا خیال بھی رکھتے تھے، یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا تھا۔

---

(۱) یہ عربی ادب کے قدیم تصانیف ورسائل کا ایک متوسط سا مگر عمدہ مجموعہ ہے، جس پر اپنے عہد کے ایک نامور عالم مولانا نور الحسن کاندھلوی (وفات ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) کی مہر ثبت ہے۔ یہ نسخہ مولانا نور الحسن کے بڑے صاحبزادے مولانا فیض الحسن محمد اکبر کاندھلوی (جو ایم اے کالج علی گڈھ میں شعبۂ عربی کے پہلے سربراہ اور پروفیسر تھے) سے علامہ شبلی نعمانی کو ملا ہوگا، علامہ شبلی نے تین سال تک مولانا محمد اکبر کے ماتحت کی حیثیت سے بطور نائب پروفیسر کام کیا تھا۔ بہر حال اس نسخہ کو دیکھ کر عجیب سی کیفیت گزری مگر یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ ملک کی کسی بڑی لائبریری میں اپنے خاندانی لائبریری کے قلمی نسخے نظر آئے ہوں، اس سے پہلے بھی اس طرح کے کئی تجربے اور مشاہدے ہوئے ہیں اور اس کے بعد بھی۔ ہندو پاکستان کی بیسیوں لائبریریوں میں ہمارے خاندانی قدیم کتب خانہ کے نسخے بکھرے ہوئے یا موجود ہیں، گویا:

چمن میں ہر طرف بکھری ہے ہوئی داستاں میری

ان کو دیکھ کر اس کا تو گہرا احساس اور افسوس ہوتا ہے کہ ہم اپنے خاندانی ورثہ کی حفاظت نہیں کر سکے، لیکن اس سے بھی اطمینان ہوتا ہے کہ اور بہت سی کتابوں کی طرح یہ نسخے ضائع نہیں ہوئے، ان کتب خانوں، لائبریریوں میں پہنچ کر محفوظ ہوگئے اور اب ان کا افادہ عام ہے۔

شاہ صاحب کو اپنے وقت کے بڑے عارف اور جلیل القدر مربی، حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے اجازت وخلافت حاصل تھی، شاہ صاحب نے اس مئے معرفت کی چاشنی عام کرنے میں زندگی بسر کردی، تمام مشاغل کے ساتھ ارشاد وتلقین کا معمول اور اصلاح وتربیت کا ہنگامہ جاری رہتا تھا، جو آخر میں گویا سب سے بڑا مقصد حیات بن گیا تھا، بے شمار افراد کا رجوع تھا، ہزاروں نے استفادہ کیا، سو سے زائد اصحاب اجازت وخلافت کے اہل پائے۔

شاہ صاحب نہایت عمدہ خوش گو شاعر بھی تھے، ان کی فکر نے غزلیات ومنظومات ہر اک وادی میں پرواز کی مگر نعت گوئی شاہ صاحب کا خاص وصف تھا، ایسی ایسی خوبصورت، سادہ وشگفتہ اشک آور نعتیں لکھی ہیں کہ ان سے کسی طرح دل سیر نہیں ہوتا، معلوم ہوتا ہے کہ لفظوں کے جلو میں شاعر کا سوز دروں اور محبت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کیفیت کھنچی چلی آرہی ہے اور اس کی تراوش سے قلب وروح معطر ہوئے چلے جارہے ہیں۔

ذاتی اوصاف وکمالات اور متنوع خدمات کے پہلو بہ پہلو کتابت اور خطاطی شاہ صاحب کا خاص فن اور ذریعہ معاش بھی تھا۔ شاہ نفیس صاحب اعلیٰ درجہ کے کاتب یا خطاط ہی نہیں تھے بلکہ ان کے قلم نے خطاطی کے فن کو ایک اعزاز وامتیاز بخشا۔ شاہ صاحب نسخ ونستعلیق کے علاوہ خط رقعہ، خط دیوانی، اور خط کوفی میں بھی ید طولیٰ بلکہ امامت کا درجہ رکھتے تھے، شاہ صاحب کے نمائندہ تحریریں خطاطی کا ذوق رکھنے والوں کے لئے ایک بیش بہا یادگار اور کمالِ فن کا نادر نمونہ ہیں، شاہ صاحب کی جنبش قلم سے جو شاہ کار وجود میں آئے ان کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں، جو آنکھوں کو نور اور دلوں کو سرور بخشتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ کی راقم سطور پر خاص شفقت کی نگاہ تھی، مستقل رابطہ رہتا تھا، خط وکتابت، علمی موضوعات کا مذاکرہ، کتابوں کی معلومات، تحقیق ودریافت کا سلسلہ، مخطوطات ومطبوعات کی آمد ورفت، خطوط اور فون پر گفتگو ہمیشہ جاری رہتی تھی آخری بیماری میں بھی کئی مرتبہ رابطہ ہوا، وفات سے سوا ڈیڑھ مہینہ پہلے بھی گفتگو ہوئی تھی، یہی آخری رابطہ اور گفتگو ثابت ہوئی:

پیدا کہاں اب ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

مولانا انظر شاہ صاحب کا نام بچپن میں سب سے پہلے دیوبند کے دینی رسائل میں پڑھا تھا جن میں مولانا کے مضامین کثرت سے چھپتے تھے، مظاہر علوم کے زمانۂ تعلیم میں مظاہر اور دارالعلوم کے طلبہ کی آپس میں کثرت

سے ملاقاتیں رہتی تھیں جس میں مظاہر اور دارالعلوم کے ممتاز اساتذہ کا اور ان کی درسی تقریروں کا تذکرہ آنا گویا ضروری تھا اس میں مولانا انظر شاہ صاحب کا نام بھی اکثر شامل رہتا تھا، خصوصاً مولانا کے انداز گفتگو کے سب ہی دل دادہ معلوم ہوتے تھے۔ جہاں تک یاد ہے راقم نے، مولانا کو سب سے پہلے سہارنپور کے تبلیغی اجتماع میں دیکھا تھا، جو اسلامیہ انٹر کالج سہارنپور کے میدان میں منعقد ہوا تھا، مولانا کشمیری تشریف لائے اور مغرب کے بعد کی نشست میں، تقریباً چالیس پینتالیس منٹ تقریر کی، مولانا کا انداز تکلم، الفاظ کی ادائیگی کا خاص انداز اور پیروں کی متواتر حرکت اب تک نگاہوں میں پھر رہی ہے، اس تقریر میں مولانا نے تبلیغی کام کی پوری طرح تائید نہیں کی تھی، اس کے بعض پہلوؤں پر تنقید بھی کی تھی، جس کو خاص طور سے اہل علم اور طلبہ نے محسوس کیا، بات امیر جماعت تبلیغ، مولانا انعام الحسن صاحب تک پہنچی اور مولانا انعام الحسن صاحب نے عشاء کے بعد جو تقریر کی اس میں اپنے اسلوب و معمول کے خلاف، مولانا کی تقریر اور شبہات کی علمی انداز میں مدلل تردید کی۔ اس کے بعد مولانا کو بارہا جلسوں میں دیکھا اور تقریریں سنیں، گل افشانی گفتار اللہ اللہ! وہ ایک سننے کی چیز ہوتی تھی، مولانا کی تحریریں کثرت سے پڑھتا رہا اور متعدد تصانیف سے بھی استفادہ کیا، لیکن مولانا سے ذاتی رابطہ کچھ نہیں تھا، رابطہ کی ابتدا از راہ کرم خود حضرت مولانا نے فرمائی تھی، مجھ کو کہاں اس کی ہمت ہوتی، جب میرے مضامین چھپنے لگے اور مولانا کے ملاحظہ سے گزرتے تو ناچیز مرتب کی حوصلہ افزائی فرماتے اور جب کہیں ملاقات ہوتی ان کا تذکرہ اور اپنی خوشی کا اظہار فرماتے۔ خصوصاً احوال وآثار کی اشاعت کے بعد سے حضرت مولانا بہت کرم فرمانے لگے تھے، رسالہ پہنچتا تو فون پر رابطہ فرماتے، مضامین کے بعض پہلوؤں پر گفتگو کرتے، اپنے تاثرات سے نوازتے، ایک دو مرتبہ مفصل گرامی ناموں سے بھی عزت بخشی (ایک گرامی نامہ احوال وآثار میں بھی شائع ہوا تھا) حضرت مولانا نانوتویؒ پر راقم کی تالیف کے بعد اس میں کچھ اور وسعت آ گئی تھی، جب کبھی ملاقات ہو جاتی کرم فرماتے اور عنایت سے مشرف فرماتے، کسی مضمون سے مسرور ہوتے تو دیر تک فون پر نوازتے تھے جس میں اس موضوع کے مضامین اور کتابوں سے شخصیات تک ہر اک کا تذکرہ آتا اور موجودہ و مرحوم شخصیتوں کے ابواب حیات کھلتے چلے جاتے بعض مرتبہ ایسی گفتگو کا دورانیہ پچیس تیس منٹ تک دراز ہو جاتا تھا۔ دو تین مرتبہ خاص کرم فرماتے ہوئے، اپنے مائدۂ نعمت پر بھی یاد فرمایا شاہ صاحب کی معلومات، فقرے اور ایک خاص انداز گفتگو، ہر اک

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

کا مصداق ہوتا تھا، مجھے معلوم نہیں کہ مولانا کی محفلوں کو کسی نے قلم بند اور مرتب کیا یا نہیں، اگر کیا ہو تو ان کے بعض

مندرجات اور معلومات بے حد مفید اور علم افزا ثابت ہوں گے، خصوصاً مولانا کے بے ساختہ تبصرے غضب کے ہوتے تھے اور بھی بہت سے کمالات تھے، کس کس کا تذکرہ کیا جائے۔

اب انہیں ڈھونڈھو چراغ رخ زیبا لے کر

تینوں ہی حضرات کی وفات ایک بڑا دینی ملی سانحہ ہے، ان حوادث کی شدت اور سنگینی اس لئے بہت بڑھ گئی ہے کہ اب جو بھی جا رہے ہیں ان کی جگہ لینے والے، ان کی کمی کو پورا کرنے والے دور، دور نظر نہیں آتے، جو مسند خالی ہوگئی وہ ہوگئی، اس لئے یہ صرف جانے والوں کا ماتم نہیں، علم وکمال کے زوال کا ماتم ہے ارشاد ومعرفت کے بجھتے چراغوں کا گلہ ہے اور فکر وبصیرت کے فقدان کا غم ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے تمام مرحومین کی بال بال مغفرت فرمائے، آخرت کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے، اور امت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ اللّٰھم آمین!

مفتی الٰہی بخش اکیڈمی اور احوال وآثار تینوں بزرگوں کی ملی علمی روحانی اولاد اور پسماندگان کی خدمات میں تعزیت پیش کرتا ہے اور بارگاہ الٰہی میں عرض گذار ہے.................. رحمھم للہ تعلیٰ رحمۃ الابرار لصلحین۔

احوال وآثار کا محرم الحرام ۱۴۱۵ھ/ جولائی ستمبر ۱۹۹۴ء میں اجراء ہوا تھا مگر قسمت سے اس کو آج تک وقت پر اور مسلسل اشاعت نصیب نہیں ہوئی، بہر حال اب تک اس کے کل سولہ شمارے چھپے ہیں، جس میں نو (۹) شمارے مختلف اوقات میں اور ایک خاص نمبر جو سات شماروں کے قائم مقام تھا شائع ہوا تھا، چوں کہ متعدد اہل ذوق اور قارئین کرام نے اب تک کے تمام شمارے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ شماروں کی مسلسل ترتیب نمایاں اور واضح رہے تاکہ ایک شمارے کا دوسرے سے التباس نہ ہو، اس مفید مشورہ کو قبول کرتے ہوئے ان شاء اللہ تعالیٰ، اس شمارے سے رسالہ کے سرورق پر شمارہ نمبر بھی چھپا کرے گا، جس کی وجہ سے شمارہ کی اشاعت میں تاخیر کی زحمت بھی کسی حد تک کم ہو جائے گی۔ شائع شدہ شماروں کی ترتیب کے مطابق یہ سترہواں شمارہ ہے، یہ نمبر سرورق پر درج کیا جا رہا ہے آئندہ بھی اس کا اہتمام رہے گا، واللہ ولی التوفیق۔

پاکستان میں احوال وآثار کے لئے اس پتہ پر رابطہ فرمایئے

سجاد الٰہی صاحب

۲۷...... مال گودام روڈ

لوہا منڈی۔ بادامی باغ

لاہور---۵۴۰۰۰

(M.0300 - 4682752)　(R.5863609 (0) 7280916)

تبرکات ونوادر

قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی آخری علمی تحریری یادگار

[جو پہلی مرتبہ شائع ہو رہی ہے]

مسئلہ زکوٰۃ اور مجلس میلاد نبوی

تمہید......................... نور الحسن راشد کاندھلوی

قاسم العلوم، حضرت مولانا نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ (وفات ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) کی جلالتِ شان، حضرت موصوف کی تصانیف اور علوم ومؤلفات کی معنویت، ان کی گہرائی اور تہہ داری ہمارے جیسوں کے تعارف کی محتاج نہیں۔ حضرت مولانا کی ہر ایک تصنیف ومکتوب، تالیف وتحریر کے زمانہ سے آج تک اہلِ نظر کی توجہات کا مرکز، بلکہ ان کی نگاہوں کا سرمہ اور علمی دنیا کے لئے لعل شب چراغ بنی ہوئی ہے، لیکن اس منزلت اور پذیرائی کے باوجود حضرت مولانا کی متعدد تالیفات وتحریرات، ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کی طباعت واشاعت کا اہتمام نہیں ہوا۔

یہاں یہ اطلاع مفید ہوگی کہ حضرت مولانا نانوتوی کی جملہ مطبوعہ تصانیف بلکہ اکثر کی جملہ اشاعتیں، ان کے ترجمے، حواشی اور شروح ومتعلقات کا غالباً پورے برصغیر میں، سب سے بڑا سرمایہ ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے، جس میں چند غیر مطبوعہ تصانیف اور مکتوبات وافادات بھی شامل ہیں۔ اس ذخیرہ نوادر وتبرکات میں سے حضرت مولانا کی ایک مختصر مگر جامع تحریر، جو زکوٰۃ اور مجلس میلاد نبوی کے بعض پہلوؤں کی وضاحت پر مشتمل ہے، آئندہ صفحات میں پیش کرنے کی سعادت ومسرت حاصل ہو رہی ہے۔

یہ حضرت مولانا کا ایک گرامی نامہ ہے جو نواب احمد حسین خاں کے نام صادر ہوا ہے۔ نواب صاحب نے حضرت مولانا سے زکوٰۃ کا ایک مسئلہ اور مروجہ مجالس میلاد کا حکم اور غالباً اس کی ممانعت کی وجہ جاننی چاہی تھی۔ حضرت مولانا نے جو آخر میں اختلافی موضوعات پر بہت کم لکھتے تھے، مکتوب نگار کے خلوص اور ذاتی روابط کی وجہ سے اس کا مختصر جواب تحریر فرمایا تھا، جس میں زکوٰۃ کے مسئلہ کی بھی کسی قدر وضاحت کی ہے اور مجالس مولود کی مخالفت کی ایک نہایت لطیف اور خاص وجہ بیان فرمائی ہے۔

یہ گرامی نامہ حضرت مولانا کی حیات کے آخری دور کی یادگار ہے۔ یہ مکتوب گرامی ۱۹؍ربیع الاوّل ۱۲۹۷ھ [۳؍مارچ ۱۸۸۰ء] کو لکھا گیا تھا۔ اس کی تحریر سے صرف ڈیڑھ مہینہ بعد ۴؍جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۹۷ھ [۱۵؍اپریل ۱۸۸۰ء] کو حضرت مولانا کی وفات ہوگئی تھی۔ یہ زمانہ حضرت مولانا کے گویا مرض وفات کا تھا۔ اس عرصہ میں بھی حضرت مولانا کی صحت کی جانب سے اطمینان نہ ہوا۔ طبیعت خراب ہی رہتی تھی، اس لئے بہت ممکن ہے کہ یہ حضرت مولانا کا آخری مکتوب گرامی اور آخری علمی تحریر ہو۔ اگر بالکل آخری تحریر نہ ہو تب بھی آخری تحریرات میں شامل ہے۔ اب تک اس کا صرف ایک قلمی نسخہ معلوم ہوا ہے جس کی وجہ سے یہ مکتوب گرامی بلا تأمل نوادر و تبرکات میں شامل کئے جانے کا مستحق ہے۔

اس مکتوب گرامی کا میری ناچیز معلومات میں اس وقت تک کہیں تذکرہ نہیں آیا۔ راقم سطور کی تالیف ''قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ احوال وآثار و باقیات ومتعلقات'' (مطبوعہ کاندھلہ ولاہور ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰ء) میں، حضرت کے آثار ومکتوبات کی مفصل فہرست [یا اشاریہ] 'ماثر قاسمی' میں بھی اس کا تعارف شامل نہیں۔

ان سطور کے ساتھ ہی یہ نادر تحفہ بلکہ دینی، علمی وملّی ورثہ قارئین احوال وآثار کی نذر کیا جارہا ہے۔ امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ یہ بھی حضرت مولانا کی تمام تحریروں کی طرح روح افزا اور سرمۂ بصیرت ثابت ہوگا۔

فالحمدللہ علیٰ ذالک

حضرت نانوتوی کا آخری مکتوب گرامی
یا علمی تحریر

مظہر الطاف وکرم نواب احمد حسین خاں صاحب سلمکم اللہ تعالیٰ۔

السلام علیکم۔ زکوٰۃ میں کھانا۔ کپڑا وغیرہ دینا بھی ایسا ہی ہے جیسا نقد دینا۔ پر اتنا لحاظ ضرور ہے کہ کھانے میں دعوت کا سا قصہ نہ ہو کہ جتنا پیٹ میں آئے کھالو، لے جانے کی اجازت نہیں، بلکہ جس کو دیا جائے اسی کو اختیار کلی دیا جائے۔ وہ اسی کی ملک سمجھی جائے۔ اس کو اختیار ہو چاہے۔ بیچ ڈالے یا خود کھالے۔ اور قرض میں زکوٰۃ ایام قرض کی بھی دینی پڑے گی۔ اتنا فرق ہے کہ اگر قرض کی یہ کیفیت ہے کہ جب چاہو وصول کرلو، تب تو اسی وقت واجب الادا ہوگی، ورنہ بعد وصول واجب الاداء ہوگی۔ مگر دینی سبھی دنوں کی پڑے گی۔

باقی رہا مولود شریف کا قصہ، اس میں آپ کا پوچھنا فضول معلوم ہوتا ہے، اور میرا بولنا بیکار نظر آتا ہے۔ اس قسم کی باتوں میں زبان ہلانے کا نتیجہ بجز فتنہ پردازی اور کچھ نہیں ہوتا۔ مگر چونکہ آپ نے پہلی بار یہ استفسار فرمایا ہے، جواب لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سنئے:

اگر کوئی شخص ملازمان شاہی میں سے سرِ دربار، بادشاہ سے زیادہ کسی وزیر مشیر کی تعظیم کرے تو وہ تعظیم چونکہ موجب توہین بادشاہی ہے، اس لئے بوجہ تعظیم مفرط وزیر یہ تعظیم کرنے والا مستوجب عتاب باشاہی ہوگا۔ تعظیم وزیر کچھ کام نہ آئے گی، بلکہ خود وزیر بوجہ مذکور درپے تذلیل شخص مذکور ہو جائے گا۔ جب یہ بات ذہن نشین ہو چکی تو اب سنئے۔

اعلیٰ درجہ کی وہ مجلس ہے جس میں قرآن وحدیث پڑھا جائے اور بیان احکام خداوندی کیا جائے اور کیوں نہ ہو! انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اس غرض سے بھیجے گئے کہ احکام خداوندی پہنچائیں اور کتب مقدسہ اسی غرض سے نازل کی گئیں کہ احکام خداوندی معلوم ہو جائیں۔ خود خداوند کریم فرماتا ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ. الذاریات ۵۶ (۱)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

---

(۱) اور میں نے جو بنائے جن اور آدمی سو اپنی بندگی کو (ترجمہ شیخ الہند)

وَمَا اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ. الآیۃ البینہ: ۵(۱)

اور ظاہر ہے کہ عبادت اطاعت احکام کا نام ہے۔ اس لئے وہ مجلس جس میں بیان احکام ہو، اعلیٰ درجہ کی مجلس ہوگی، کیونکہ غرض اصلی عبادت ہے۔ چنانچہ دونوں آیتیں اس پر شاہد ہیں۔ بے بیان، احکام محقق نہیں ہوسکتے۔ غرض مجلس وعظ و درس قرآن وحدیث کے برابر کوئی محفل نہیں۔ پھر ستم یہی نہیں کہ اس محفل کے لئے تو کچھ اہتمام نہ ہو، نہ اس میں اس برکت کی امید ہو۔ جو محفل میلاد شریف سے رکھتے ہیں اور نہ اس کے لئے فرش وفروش، روشنی وشیرینی وغیرہ ہو جو محفل میلاد شریف کے لئے مہیا کی جاتی ہے، علاوہ بریں میلاد شریف کی بدولت جماعت سی واجب چیز کو ترک کیا جائے اور جماعت کے لئے میلاد شریف ترک نہ کیا جائے اور یہ اسی قسم کی بات نہیں تو اور کیا ہے کہ بادشاہ سے زیادہ وزیر کی تعظیم کی جائے۔

پھر اس پر قیام معمول بہ اگر بایں اعتقاد ہے کہ روح پرفتوح حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت رونق افروز ہوتی ہے تو یہ اعتقاد بے سند ہے کہ جس کا پتہ نہ قرآن میں نہ نشان حدیث میں۔ اگر یہ بدعت نہ ہوگا تو اور کون سی چیز بدعت ہوگی؟ شیعوں اور خوارج کے اعتقادات جو ان کے مبتدع اور ضال ہونے کی وجہ سمجھی گئی تو کیوں سمجھی گئی؟ اسی بے سند ہونے کے باعث۔ اور اگر بایں خیال یہ اہتمام قیام ہے کہ بعض اولیائے کبار اس وقت کھڑے ہوئے تھے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہم بھی اسی طرح مشرف بہ زیارت ہوتے ہیں جیسے وہ اولیاء مشرف ہوئے تھے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بعض اولیائے کبار ارباب حال کو وقت ذکر ولادت شریف، دولت زیارت میسر آئی تھی۔ اس لئے ان کے واسطے اٹھنا ضرور ہوا۔ بے شک اگر وہ اس وقت نہ اٹھتے تو عجب نہ تھا کہ اس بدتعظیمی کے سبب اپنے مرتبہ ومقام سے گر جاتے مگر عوام الناس جو ان کی اقتدا کرتے ہیں گویا زبان حال سے یوں جتلاتے ہیں کہ گویا ہم بھی دولت زیارت سے مشرف ہوئے ہیں۔ اب کہئے یہ کس درجہ کی ریا ہے؟

بعض اولیاء کو چند بار یہ اتفاق ہوا کہ اپنے حلقہ میں یا شیخ بہاء الدین شَیْئًا لِلّٰہ کہا۔ ان کے ایک مرید نے بھی یہ کہنا شروع کر دیا، حضرت نے فرمایا تم کیوں کہتے ہو؟ مرید نے کہا کہ آپ کہتے ہیں میں بھی کہتا ہوں، حضرت نے فرمایا کہ مجھ کو تو حضرت کی زیارت میسر آتی ہے۔ اس لئے یہ کہہ پڑتا ہوں تو جو کہتا ہے کیوں کہتا ہے؟ غرض حضرت نے اس کو منع فرمایا اور اپنی اقتداء اور اتباع کی اس امر میں اجازت نہ دی۔ ایسے ہی جن صاحبوں نے وقت مذکور پر قیام کیا وہ مشرف بزیارت ہوئے تھے، عوام کو ان کا اقتداء جائز نہیں۔

(۱) اور ان کو حکم یہی ہوا کہ بندگی کریں خالص کر کے اس کے واسطے بندگی (ترجمہ شیخ الہند)

باقی یہ کہنا کہ ہم بغرض تعظیم اسم مبارک کھڑے ہوتے ہیں، یہ ایسی بے ہودہ بات ہے کہ کوئی عاقل تسلیم نہیں کرسکتا۔ کیا اسی وقت آپ مستحق تعظیم ہوتے ہیں؟ اس سے آگے پیچھے ان لوگوں کے نزدیک مستحق تعظیم نہیں ہوتے؟ افسوس آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر پرانوار کو ایسی ایسی واہیات سے ناواقفوں نے خراب کردیا۔

اس لئے اپنا یہ قول ہے کہ ہمارے لئے تو مولود شریف اگر کریں جائز بلکہ مستحب ہے، پر رواج کے موافق کرنے والوں کے حق میں جائز نہیں۔ ہاں گوشۂ تنہائی میں بے قیام کوئی کبھی بتقاضائے محبت بروایات صحیحہ پڑھ لیا کرے تو سبحان اللہ! پر ان روایات ضعیفہ موضوعہ کا پڑھنا یوں بھی جائز نہیں۔

غرض اصل سے ذکر بابرکات حضرت سرورِ عالم علیہ وعلیٰ آلہٖ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات عمدہ حسنات میں سے تھا، گو ذکر احکام اور استماع احکام بغرض اطاعت و تبلیغ حقیقت میں ذکر ملک علام ہے، مگر جیسے تنجن و زعفران وغیرہ اطعمہ لذیذہ اصل سے عمدہ غذا ہوتی ہے، پر زہر مل جائے تو باوجود عمدگی خراب ومہلک ہوجاتی ہیں، اور اس وقت بوجہ اختلاط زہر باوجود لذت معلومہ اس لذت کا ترک ضروری ہے، چہ جائیکہ بوجہ لذت زہر مخلوط کا کھانا عمدہ سمجھا جائے۔ ایسے ہی ذکر خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم متضمن ولادت ہو یا متضمن وفات عمدہ خیرات میں سے ہے، پر بالائی خرابیوں کے باعث واجب الاحتراز ہے، چہ جائیکہ خرابی ہائے مذکورہ بوجہ عمدگی سفوہ واجب الارتکاب ہوں۔

لیجئے نواب صاحب! آپ کی خاطر یہ دو ورق سیاہ کرڈالے ہیں، پر دیکھئے اس نامہ سیاہ کے حق میں اس تحریر کے باعث کیا کیا صلوٰتیں ادھر سے پیش ہوتی ہے۔

مولوی عبدالکریم صاحب کی خدمت میں بعد سلام یہ عرض ہے کہ عنایت نامہ پہنچا، اس تفقد احوال کا شکریہ کیا ادا کروں اور اپنا حال لکھوں تو کیا لکھوں؟ دو دن کو اوروں کی دعا سے کچھ آرام سے گزرتی ہے تو دو دن اپنی شامت اعمال سے پھر تکلیف کوئی نہ کوئی کھڑی ہوجاتی ہے اب آج کل اللہ کا شکر ہے کہ تخفیف ہے، چند روز پہلے بہ شدت گذری، اس وجہ سے بھی جواب نامہ نواب صاحب و نیز جواب عنایت نامہ سامی میں دیر ہوئی۔

یا وہ دن تھے کہ ورق دو ورق ایک بات تھی، یا یہ دن ہیں کہ جواب خطوط بھی دشوار ہے۔ پہلے گھنٹہ دو گھنٹہ کی تقریر کو میں کچھ نہیں سمجھتا تھا، اور اب بعض اوقات دو چار جملوں کا ادا کرنا بھی ایک مہم عظیم ہوجاتی ہے۔ اب آپ کے شاگردوں اور احباب کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں۔ فقط

العبد محمد قاسم
۱۹ ربیع الاوّل ۱۲۹۷ھ ۲ مارچ ۱۸۸۰ء

حضرت امام حسن بن محمد صغانی

ان کی بابرکت تصنیف مشارق الانوار

کا ایک عمدہ اردو ترجمہ، تحفۃ الاخیار اور اس کی چند قدیم اہم اشاعتیں

مختصر تعارف

از: نورالحسن راشد کاندھلوی

برصغیر ہند میں اسلام اور مسلمانوں کے پہلے قدم کب آئے اور سب سے پہلے کونسی سرزمین قرآن مجید کی تجلیات سے منور و سرفراز ہوئی اور کہاں اسلام کا آفتاب سب سے پہلے جلوہ فرما اور روشن ہوا، اس کی صحیح تاریخ بیان کرنا آسان نہیں ہے، مگر شواہد و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے بعض ساحلی علاقوں میں عہد نبوت کے ابتدائی زمانہ میں مسلمان اور دعوت اسلام پہنچ گئی تھی، شیخ زین الدین معبّری نے تحفۃ المجاہدین میں لکھا ہے کہ مالابار کا راجہ شق القمر کا معجزہ دیکھ کر مشرف بہ اسلام ہوگیا تھا(۱) بعض اور آثار و شواہد سے بھی ہندوستان میں عہد نبوت میں اسلام کی روشنی پہنچنے کا تذکرہ ملتا ہے۔ اگر اس طرح کی چند روایات و آثار پائے ثبوت کو پہنچ جائیں تو کہا جاسکتا ہے کہ شمالی مغربی ہندوستان (خصوصاً بلند شہر اور بجنور میں گنگا کی ساحلی بستیوں) میں بھی اسلام کی دعوت اور پیام عہد رسالت مآب میں پہنچ گیا تھا۔ اگر ان روایات پر بہت اعتماد نہ کیا جائے، اس وقت بھی اس میں شک نہیں کہ برصغیر ہند کے ساحلی علاقون، خصوصاً سندھ، گجرات اور مالابار وغیرہ میں عہد خلافتِ راشدہ میں اسلام کے نمائندے، حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین تشریف لائے تھے اور یہاں اسلام کی دعوت پہنچ گئی تھی۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں مجاہدین لاہور تک آگئے تھے۔ یہ امر بھی محتاج ثبوت نہیں کہ سرزمین ہند خصوصاً اس کے ساحلی علاقوں پر اسلام کے مقدس ترین اوّلین نمائندے حضرات صحابہ کرامؓ تشریف لائے تھے(۲) انھوں نے یہاں جنگی

(۱) تحفۃ المجاہدین زین الدین معبریؒ اردو ترجمہ حکیم شمس اللہ قادریؒ ص: ۱۴/۱۳ (علی گڑھ: ۱۳۶۱ھ)

(۲) ہندوستان میں پچیس صحابہ کرام اور پینتالیس تابعین کے آنے کا اجمالی یا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو: برصغیر میں اسلام کے اوّلین نقوش (پاک و ہند میں صحابہ و تابعین اور تبع تابعینؒ) مولانا محمد اسحاق بھٹی، لاہور: ۱۹۹۴ء

مہمات میں حصہ لیا اور دعوت اسلام کی جدوجہد فرمائی تھی۔ اور اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ جب حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین یہاں تشریف فرما ہوگئے ہوں گے تو ان کے انفاس قدسیہ کی برکت اور ان کے اعمال واخلاق کی تابنا کی سے سیکڑوں، ہزاروں افراد دولت اسلام سے مشرف ہوئے ہوں گے۔ مگر افسوس کہ اس مبارک عہد اوران اوّلین ہندی مسلمانوں کی تفصیلات، ان کے قبول اسلام اور خدمت دین کی روداد محفوظ نہیں۔ ہمارے یہاں جو تاریخیں لکھی گئی ہیں اور ہندوستان کے اسلامی عہد کے جو واقعات ذکر کئے جاتے ہیں ان کی ابتدا سندھ پر محمد بن قاسم کی یلغار اور اس کے بعد کی اسلامی حکومت کے تذکرے سے ہوتی ہے۔ یہ تاریخ بھی سندھ اور اس کے نواح کی وادیوں تک محدود ہے۔ سندھ سے پنجاب، پنجاب سے دہلی اور ہندوستان کے ہمالیائی اور وسطی علاقوں میں اسلام کی ابتدائی تاریخ یکسر نامعلوم اور مفقود ہے مگر جس قدر بھی معلومات ہیں اور جو مختصر اشارات اربابِ تاریخ نے محفوظ کر لئے ہیں، ان سے یہ ضرور معلوم ہوجاتا ہے کہ ہندوستان کا اسلام، خدمت اسلام دعوت اسلام اور اسلامی علوم وفنون کی پذیرائی میں بہت پرانا نہایت وسیع اور مسلسل حصہ رہا ہے۔

جب حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اس سرزمین پر جلوہ افروز ہوئے ہوں گے، اسی وقت سے یہاں قرآن کریم کی تعلیم، اس کی شرح وتفسیر، نیز حدیث شریف اور اس کے متعلقات کا ذکر وتذکرہ اور چرچا عام ہوگیا ہوگا۔ چند افراد نے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے براہِ راست احادیث سنی ہوں گی، بہت سوں کو حضرات تابعین کرام کی خدمات میں حاضری کی عزت وسعادت ملی ہوگی، اس طرح سرزمین ہند کو سرچشمۂ اسلام سے براہ راست رابطہ اور تلمذ واستفادہ کے اہم ترین مواقع حاصل ہوئے اور دین خالص اور قرآن وسنت کے ابتدائی مخاطبین کی زیارت کا شرف ملا۔ اس لئے بلا تامل کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں علوم اسلامی کی آمد، اس کی روایات اور اس کی تاریخ، دنیائے اسلام خصوصاً عرب ملکوں کی عملی تاریخ سے بہت متاخر نہیں۔

یہ حضرات صحابہ کرامؓ اور برصغیر ہند میں اسلام اور علوم اسلامیہ کے اوّلین داعیوں کی خدمات واثرات کی برکت تھی کہ اسی عہدِ زرّیں میں، ہندی مسلمانوں میں سے درجنوں اصحاب وافراد علوم اسلامیہ سے محبت وانسیت کی وجہ سے اس کے منابع سے براہ راست سیراب ہونے کے لئے ہندوستان سے نکل کر حجاز، کوفہ، بصرہ اور بغداد پہنچے اور تمتع زہر گوشہ یافتم پر عمل کرتے ہوئے اپنے دامن مراد کو پُر کیا۔ ان میں سے کچھ اصحاب اسلامی علوم، قرآن کریم، تفسیر، حدیث وفقہ اور ان کے متعلقات میں اس درجہ ماہر وممتاز ہوگئے تھے کہ دنیائے

اسلام کے بڑے بڑے علماء نے ان کا لوہا مانا، ان سے شاگردی، تلمّذ اور استفادہ کو عزت وسعادت سمجھا اور ان کی خدمات وکمالات کی تحسین فرماتے ہوئے اعتراف کیا کہ قرآن وسنّت کی خدمت واشاعت اور توضیح وتبلیغ میں علمائے ہند کا بہت بڑا اور نہایت قابل قدر حصہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ اپنی اپنی تصانیف سندات اور تحریرات میں ان خدمات کا ممنونیت وتشکر کے احساس کے ساتھ بلند الفاظ میں تذکرہ فرمایا اور ان علوم میں علماء ہند کا تخصص اور امتیاز بھی تسلیم کیا گیا۔

دیار ہند میں روایت وخدمت حدیث کا آغاز سندھ اور گجرات کے ساحلی علاقوں سے ہوا تھا۔ دوسری و تیسری صدی ہجری میں سندھ میں حدیث کے چند ایسے نامور اساتذہ اور اہل فضل وکمال موجود تھے جو حضرت عمر بن عبدالعزیز اور حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے جلیل القدر تابعین کے شاگرد اور ائمہ کبار کی مجالس کے حاضر باش تھے۔ اس فہرست میں ایک نسبتاً مؤخر مگر نمایاں نام حضرت ربیع بن صبیح سندھیؒ وفات سنہ ۱۶۰ء (۷۶-۷۷ء) کا ہے(۱)۔ جو ملا کاتب چلپی کے بقول دنیائے اسلام کے پہلے مصنف تھے(۲)۔ ان کے علاوہ بھی ہندوستان خصوصاً سندھ کے متعدد افاضل اور اہل کمال کا نام یا تذکرہ آتا ہے جو ذوق علم سے سرشار ہوکر ہندوستان سے حجاز اور اس وقت کے بڑے بڑے علمی مراکز، کوفہ، بصرہ، دمشق اور بغداد وغیرہ گئے تھے اور دنیائے اسلام کے بڑے بڑے علماء، محدثین اور اہل فضل وکمال کی صحبتوں اور مجلسوں میں باریاب ہوکر علم وکمال سے مالا مال ہوئے تھے۔ ان میں سے چند افراد نے ہندوستان واپس آکر یہ دولت اس خطہ میں عام کی اور اپنی زندگی کے اکثر اوقات خدمت علم دین اور حدیث کی نشر واشاعت اور تعلیم میں بسر فرمائے۔

علم کا یہ کارواں اور خدمت حدیث کی یہ لگن، سندھ، گجرات اور بلوچستان وغیرہ کی وادیوں سے گزرتی ہوئی پنجاب اور دوسرے علاقوں میں آئی۔ پنجاب بلکہ شمالی ہند کے پہلے محدث جن کا تذکرہ مورخین نے محفوظ کیا ہے شیخ محمد اسماعیل لاہوری ہیں(۳) جو چوتھی صدی ہجری کے آخر (۳۹۵ھ/۱۰۰۴ء) میں ہندوستان تشریف لائے اور لاہور میں فروکش ہوگئے۔ شیخ اسماعیل کی محنت اور کوششوں سے لاہور، پنجاب اور نواحی علاقوں میں دین کی خدمت عام ہوئی اور اسلامی علوم خصوصاً حدیث شریف سے انسیت اور اس کی تعلیم واشاعت کے ذوق نے اس

---

(۱) حضرت ربیع بن صبیح کا تقریباً تمام قدیم مآخذ میں مفصل تذکرہ موجود ہے۔

(۲) کشف الظنون، کالم نمبر ۶۳۷ جلد اوّل (بغداد: بلا سنہ)

(۳) علم حدیث میں برصغیر پاک وہند کا حصہ تالیف ڈاکٹر محمد اسحاق اردو ترجمہ شاہد حسین رزاقی ص: ۱۷ وما بعد (لاہور: ۱۹۷۷ء)

قدر ترقی کی کہ لاہور شہر خدمت حدیث کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔ کئی صدیوں تک لاہور میں متواتر بڑے بڑے محدثین علماء اور خادمان حدیث پیدا ہوتے رہے۔ اسی کاروان علم وعمل کے ایک بڑے قائد، عالم اور رہنما، حدیث فقہ اور لغت کے امام، محدث دہر، حضرت علامہ حسن بن محمد صغانی لاہوری ہیں، جو حدیث کی شہرۂ آفاق کتاب مشارق الانوار کے مصنف اور پوری دنیا کے مایہ ناز اور ممتاز ترین علمائے لغت میں سے ہیں۔

علامہ صغانی کا وطن اور خاندان

ماوراء النہر میں دریائے دخش کے مغرب اور دریائے جیحون کے جنوب میں ایک علاقہ ہے، جسے عربی میں صغانیان اور فارسی میں چغانیان کہا جاتا ہے(۱) اس بستی یا شہر میں ایک عربی الاصل گھرانہ جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سے تھا، آباد تھا۔ اس خاندان کی قدیم تاریخ اور عرب ملکوں سے یہاں آنے کا زمانہ اور سبب معلوم نہیں۔ یہ خاندان غالباً محمود غزنوی کے عہد میں یا اس کے بعد کے قریبی زمانہ میں چغانیان سے غزنہ آ گیا تھا اور غزنہ میں قیام کرلیا تھا، مگر جب محمود غزنوی کے خاندان پر زوال آیا اور خصوصاً علاء الدین غوری جہاں سوز نے سنہ ۵۴۴ھ (۵۰-۱۱۴۹ء) میں غزنہ پر حملہ کیا اور اس کو لوٹ کر جلا دیا، اس وقت یمین الدولہ خسرو شاہ بھی غزنہ سے بھاگ کر لاہور آ گیا تھا(۲) اور اس زمانہ میں متعدد علماء اور اہل کمال بھی غزنی سے ترک وطن کر کے لاہور آ گئے تھے، انہی خاندانوں میں یہ فاروقی گھرانہ تھا جو چغانیان سے غزنی آ کر مقیم ہوا تھا۔ اسی خانوادہ کے ایک فرد نامور محدث اور مشارق الانوار کے مصنف، علامہ حسن بن صغانی کے والد ماجد شیخ بن حسن صغانی بھی تھے۔

شیخ حسن بن محمد صغانی

حسن بن محمد کا مفصل نسب دریافت نہیں، جو واسطے ملے وہ یہ ہیں:

''حسن بن محمد بن حیدر بن علی بن اسماعیل''(۳)

شیخ حسن حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں تھے۔ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی کا قول ہے:

---

(۱) صغانیان غالباً وہی شہر ہے جس کو آج کل مراسیا کہتے ہیں، جو دریائے صغانیان کے بالائی حصہ میں واقع ہے، دریائے صغانیان کو نہر زامل بھی کہتے ہیں۔ اصطخری کہتا ہے کہ صغانیان چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں ترمذ سے بڑا شہر تھا اور کسی نے اس شہر کو رملہ کے مشابہ بنا دیا اور لکھا ہے کہ یہاں ایک بڑی جامع مسجد تھی۔ روئی یہاں کی بہت عمدہ ہوتی تھی۔ جغرافیہ خلافت مشرقی۔ لی۔ اسٹرینج ترجمہ محمد جمیل الرحمٰن ص:۶۸۴-۶۸۳ (نقل دار الترجمہ حیدرآباد۔ اسلام آباد:۱۹۸۶ء)

(۲) جغرافیہ خلافت مشرقی جی۔ لی۔ اسٹرینج ص:۵۲۶

(۳) علامہ ذہبی نے صرف تین واسطے ذکر کیے ہیں۔ سیر اعلام النبلاء ص:۲۸۳ جلد:۲۳ بروکلمان نے آخری نام اسماعیل کا اضافہ کیا ہے۔ تاریخ الادب العربی ص:۲۱۲ جلد:۶ ترجمہ سید یعقوب بکر (قاہرہ ۱۹۷۷ء)

"کان من نسل عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ"(١)

نسب کی تفصیلات سے قطع نظر، محمد بن شیخ حسن بن محمد صغانی کے حالات بھی دستیاب نہیں، لیکن علامہ صغانی نے اپنی کتابوں میں جس طرح ان کا ذکر کیا ہے، اس سے واضح ہے کہ شیخ محمد حسن بن محمد بھی اپنے عہد کے علامۂ اجل، ادب ولغت کے ماہر، بلند پایہ محقق اور علوم ظاہری و باطنی میں کامل بلکہ فرد فرید تھے۔

شیخ محمد حسن بن محمد کو غالباً تصنیف و تالیف کا موقع نہیں ملا، ان کے تلامذہ اور دیگر دینی علمی خدمات کا تذکرہ بھی مفقود ہے، مگر علامہ محمد حسن بن محمد کا یہی ایک کمال ہزاروں تصانیف پر بھاری ہے کہ انھوں نے مؤلف مشارق الانوار جیسا فاضل جلیل اور فخر زمانہ فرزند یادگار چھوڑا۔ اس کی ایسی تربیت کی اور اس کو علوم وفنون کا سفر اس خوبی اور مہارت سے طے کرایا کہ وہ اپنے عہد کا امام، مرجع خلائق محدث اور امت کا مایۂ ناز فرد ثابت ہوا۔

شیخ محمد بن حسن کا خاندان اگرچہ لاہور آ گیا تھا لیکن غزنی سے رابطہ تھا، ہمیشہ وہاں آنا جانا رہتا تھا محمد بن حسن کی زندگی کا آخری زمانہ بھی غزنی میں گزرا۔ ان کی ٥٩٠ھ (٩٤-١١٩٣ء) کے قریب غزنی میں وفات ہوئی۔ سنہ وفات کی صراحت نہیں ملی لیکن علامہ صغانی نے مختلف موقعوں پر اپنے والد کے جو واقعات واقوال نقل کئے ہیں، ان میں ٥٩٠ھ کے بعد کا کوئی واقعہ نہیں ہے، جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ شیخ محمد بن حسن ٥٩٠ھ میں رحلت فرما گئے ہوں گے۔

علامہ صغانی کی ولادت

شیخ محمد بن حسن کے صاحبزادے علامہ حسن ١٥ر صفر ٥٧٧ھ (٨٢-١١٨١ء) (٢) کو لاہور (٣) میں پیدا ہوئے، والد کے زیر سایہ

---

(١) سبحة المرجان فی آثار ھندوستان، تحقیق فضل الرحمٰن ندوی، ص:١٧٠، جلد:١ (علی گڑھ:١٩٧٦ء)

(٢) قدیم مؤرخین اور تذکرہ نگاروں نے علامہ کی تاریخ پیدائش کا ذکر نہیں کیا، ہندوستانی مؤرخین میں سے علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے، سبحة المرجان اور ماثر الکرام ص:١٨١ (آگرہ:١٣٢٨ھ/١٩١٠ء) دونوں میں ١٥ر صفر تاریخ پیدائش لکھی ہے۔

(٣) حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مجموعۂ ملفوظات فوائد الفواد (ص:١٠٤، فارسی، نول کشور، لکھنؤ:١٣٠٢ھ) کے ایک اندراج کی وجہ سے یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ علامہ صغانی کا وطن بدایوں تھا، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ علامہ کے قریب العہد مؤرخین نیز علامہ ذہبی نے بھی امام صغانی کا وطن اور پیدائش لاہور کی لکھی ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ خود علامہ صغانی نے اپنی تصانیف میں اپنی پیدائش لاہور کی لکھی ہے۔ اس لئے علامہ کو بدایونی لکھنا صحیح نہیں۔ غالباً اسی التباس کی وجہ سے مولانا عبدالحیٔ حسنی نے نزہة الخواطر میں علامہ رضی الدین صغانی لاہوری اور رضی الدین بدایونی کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ لکھا ہے۔ مولانا عبدالحلیم صاحب چشتی کا خیال یہ ہے کہ فوائد الفواد میں بھی دراصل لاہوری ہی تھا۔ سہو کتابت سے یا تصحیف ہو کر بدایونی ہو گیا۔ ملاحظہ ہو: معارف اعظم گڑھ: فروری ١٩٩٥ء ص:١٢٧، اس بحث کی مزید معلومات کے لئے دیکھئے مضمون: علامہ صغانیؒ بدایونی یا لاہوری؟" سہ ماہی فکر ونظر اسلام آباد۔ ص:٨٣ تا ٩٥ جنوری مارچ سنہ ١٩٩٧ء

تربیت پائی، ابتدائی درسیات اور ضروری کتابیں والد ماجد سے پڑھیں، ہمیشہ والد کے ساتھ رہتے تھے۔ علم کا بے حد شوق تھا، اعلیٰ درجہ کا حافظہ عطا ہوا تھا، جو کچھ والد سے سنتے وہ لوح دماغ پر نقش ہوجاتا تھا، اس وجہ سے برسوں کا علمی سفر مہینوں میں طے ہوگیا۔ مگر یہ عام روایت اصلاح طلب ہے کہ علامہ نے پوری تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی اور والد کی حیات میں عالم فاضل ہوگئے تھے۔ اگر مؤرخین اور تذکرہ نگاروں کا یہ خیال درست ہے کہ شیخ محمد حسن کی ۵۹۰ھ میں وفات ہوگئی تھی، تو اس وقت علامہ صغانی تیرہ سال کے ہوں گے، تیرہ سال کی عمر میں درسیات کی تکمیل ممکن تو ہے لیکن دوسرے معتبر مآخذ سے علامہ کے اور بھی متعدد اساتذہ کا علم ہوتا ہے، جو اس کی شہادت ہے کہ علامہ نے اگرچہ بیشتر تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی، ان کی زندگی کے آخری ایام تک ان سے ہمیشہ اور مسلسل استفادہ کیا، جس کا علامہ اپنی تصانیف میں نہایت ممنونیت اور تشکر کے ساتھ بار بار ذکر فرماتے ہیں، لیکن علامہ صغانی نے اپنا علمی تعلیمی سفر والد سے تعلیم اور استفادہ پر ختم نہیں کردیا تھا، بلکہ وہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں ہندوستان سے حجاز، یمن اور بغداد تک گئے تھے، ہر جگہ کے بڑے بڑے علماء اور نامور محدثین سے اکتساب کمال کیا تھا اور اجازت اور سند حدیث حاصل کی تھی۔

علامہ نے عرب دنیا کے متعدد طویل سفر کئے اور دور دراز علاقوں تک پہنچے تھے، جس میں سیکڑوں علماء سے ملاقاتیں استفادہ اور مذاکرات ہوئے ہوں گے، لیکن علامہ کے معلوم اساتذہ کی فہرست صرف چند ناموں پر مشتمل ہے۔ علامہ ذہبی نے (جو ایک واسطے سے صغانی کے شاگرد بھی ہیں) علامہ صغانی کے صرف چار اساتذہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ علامہ صغانی نے مکہ مکرمہ میں ابوالفتوح نصر بن الحصری سے، یمن میں قاضی سعدالدین خلف بن محمد الحسناباذی اور نظام بن حسن مرغینانی سے، بغداد میں سعید بن محمد الرزاز سے پڑھا۔(۱)

مگر اس اطلاع میں کچھ فروگذاشت ہے کیوں کہ ہندوستانی تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ علامہ سعدالدین خلف بن محمد اور مؤلف ہدایہ کے فرزند، علامہ نظام الدین عمر بن محمد بن حسن مرغینانی سے ہندوستان میں پڑھا ہے(۲) یہ دونوں عالم ہندوستان آگئے تھے، یہیں علامہ صغانی ان کے حلقہ درس میں حاضر ہوئے اور استفادہ کیا۔

علامہ صغانی کے اعلیٰ علمی مقام میں علامہ کے والد اور اساتذہ کرام کی محنت وتوجہ کے علاوہ، علامہ کے ذوق وشوق اور غیر معمولی حافظہ کا بھی خاص حصہ ہے۔ علامہ بڑی بڑی دقیق عالمانہ کتابوں کو زبانی یاد کرلیتے

---

(۱) سیر اعلام النبلاء۔ ص:۲۸۳ جلد:۲۳ (طبع اول، بیروت)

(۲) التمہید لتعریف ائمہ التجدید، مولانا عبیداللہ سندھی، ص:۲۰۹ (جام شورو، سندھ:۱۳۹۶ھ)

تھے۔ علامہ کے ذوق وشوق اور قوت حافظہ کا اس سے بھی علم ہوتا ہے کہ علامہ کے زمانۂ طالب علمی میں ایک مرتبہ ابوعبید قاسم بن سلاّم کی ''غریب الحدیث'' کے زبانی مکمل یاد کرنے پر ایک ہزار درہم کے انعام کا اعلان ہوا تو علامہ صغانی نے غریب الحدیث زبانی یاد کر کے سنائی (۱) اور ایک ہزار درہم انعام حاصل کیا۔ اس طرح نہ معلوم کس قدر کتابیں ازبر ہوگئی ہوں گی۔

علامہ کو عربی لغت کا ذوق اپنے والد سے ورثہ میں ملا تھا۔ علامہ نے والد کے ذوق علم اور عربی لغت میں مہارت کا کئی موقعوں پر ذکر کیا ہے۔ والد نے اپنا تمام علم اور ذوق بیٹے میں منتقل کر دیا تھا، جس کو لائق وفائق بیٹے نے آگے بڑھایا اور درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔

علامہ صغانی نے والد کی وفات کے بعد غزنہ میں کس قدر وقت گزارا اس کا علم نہیں۔ غزنہ سے آ کر لاہور کے علماء کی خدمات میں حاضر ہوئے اور حدیث وفقہ کی کتابیں پڑھیں۔ ہدایہ کے مصنف کے صاحبزادہ سے فقہ پڑھی، دوسرے علماء سے بھی تلمّذ ہوا، حدیث وفقہ اور لغت میں مہارت حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد کچھ عرصہ وطن لاہور میں گزارا اور پورے ملک کے طول وعرض کے لمبے لمبے سفر کئے۔ علامہ کے قریب العہد بعض ہندوستانی مآخذ میں علامہ کے گجرات، ناگور، جالور وغیرہ اور وسط ہند کے سفروں کا اجمالی ذکر آیا ہے (۲) یہ سفر یقیناً دینی وعلمی مقاصد سے ہوئے ہوں گے مگر ان سفروں میں کن علماء اور اہل فضل وکمال سے ملاقاتیں ہوئیں اور کیا مشاہدات ومذاکرات فرمائے، اس کا ذکر نہیں ملا۔ اسی درمیان کئی مرتبہ عرب ملکوں کے سفر پر بھی نکلے، یہ سفر وقفہ وقفہ سے کئی مرتبہ ہوئے۔ اگرچہ ہر سفر میں خاصا وقت لگا مگر ان کے بھی واضح احوال نہیں ملتے۔ تاہم یہ طے ہے کہ متعدد سفر ہوئے۔ یہ سفر بھی دو طرح کے تھے، ایک ذاتی تعلیم وتعلم کے لئے۔ دوسرے خلافت اسلامیہ بغداد یا حکومت ہند کے نمائندہ اور سفیر کی حیثیت سے۔

علامہ کا ہندوستان سے پہلا علمی سفر، بہ ظاہر ۶۰۵ھ (۹۔۱۲۰۸ء) میں ہوا، جو علامہ کا پہلا سفر حجاز بھی ہے، اسی سفر میں مکہ مکرمہ میں سنن ابوداؤد کے درس میں حاضر رہے۔ اس سے فراغت کے بعد مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ حرمین شریفین میں تقریباً ایک سال تک حاضری کے بعد ۶۰۶ھ (۱۰۔۱۲۰۹ء) میں مکہ مکرمہ سے یمن کا

---

(۱) معجم الادباء یاقوت حموی ص: ۹۵۔۹۴ جلد: ۳ (دار الکتب العلمیہ، بیروت: ۱۴۱۱ھ)

(۲) سرور الصدور (نسخہ جامعہ ہمدرد، کراچی) کے حوالہ سے مولانا سید رضوان علی صاحب ندوی نے اپنے مضمون میں اس کا ذکر کیا ہے۔ مجلہ الدراسات الاسلامیہ، اسلام آباد، اپریل جون ۱۹۹۷ء۔ ص: ۳۴

سفر کیا۔ سنہ ۶۰۹ھ (۱۳۔۱۲۱۲ء) میں مقدیشو (جو صومالیہ کا دارالحکومت ہے) گئے۔ وہاں سے عدن، یمن واپس آئے۔ سنہ ۶۱۳ھ (۱۷۔۱۲۱۶ء) میں دوبارہ مکہ مکرمہ حاضر ہوئے۔ اس سفر میں عربی کے شہرۂ آفاق ادیب اور مصنف یاقوت حموی کی علامہ صغانی سے ملاقات ہوئی تھی۔ (۱) اس موقع پر غالباً دو سال مکہ مکرمہ میں گزارے۔

سنہ ۶۱۵ھ (۱۹۔۱۲۱۸ء) میں مکہ معظّمہ سے بغداد کے لئے روانہ ہوئے، جو علامہ کا بغداد کا پہلا سفر تھا۔ بغداد پہنچتے ہی سب سے پہلے حضرت معروف کرخیؒ کے مزار پر حاضر ہوکر فاتحہ پڑھی اور دعا کی۔ بغداد کے علماء خصوصاً شیخ سعید بن رزاز وغیرہ سے استفادہ کیا اور اجازات لیں۔ ان سفروں میں محدثین کرام اور علماء سے اس کثرت سے استفادہ کیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ فرماتے تھے کہ میں نے مکہ معظّمہ، ہند، یمن اور بغداد میں چارسو کے قریب مسلسل احادیث سنی ہیں، جو مسلسل احادیث کی آخری انتہائی تعداد ہے (۲)

بغداد کا یہ سفر علم وافادہ کے لئے ہوا تھا، اس لئے اس کے تمام اوقات تعلیم وتعلم، استفادہ اور تصنیف وتالیف میں گزرے۔ اس دو سال کے قلیل عرصہ میں بغداد کے اعلیٰ علمی حلقوں اور اہل اقتدار کی محفلوں میں علامہ صغانی کے مراتب وکمالات کا غیر معمولی چرچا اور تذکرہ ہوگیا تھا۔ علامہ کے کمالات علمی اور علماء کی نظر میں ان کی قدر ومنزلت کی خبریں خلیفۂ وقت تک پہونچیں تو خلیفہ نے علامہ کو اپنے سفیر کی حیثیت سے سلطان شمس الدین التمش کے پاس ہندوستان جانے کی دعوت دی، جو علامہ نے قبول فرمائی اور سنہ ۶۱۷ھ (۲۱۔۱۲۲۰ء) میں خلیفۃ المسلمین کے نمائندہ کی حیثیت سے بغداد سے دہلی کے لئے روانہ ہوئے اور اسی سال دہلی پہونچ گئے۔ دہلی میں سفارت کی کیا خدمات تھیں، دربار سلطان میں علامہ کی کس کس طرح پذیرائی ہوئی اور اس سفر کے کیا مقاصد تھے؟ اس کا ذکر نہیں ملا۔ علامہ اس سفر کے بعد اندازاً سات سال تک ہندوستان میں قیام فرمارہے۔

الناصر لدین اللہ کے بعد مستنصر باللہ خلیفہ ہوا، اس نے علامہ کو بغداد واپس آنے کی ہدایت کی۔ علامہ دہلی سے بغداد واپس گئے۔ خلیفہ بغداد نے علامہ کو دوبارہ اپنا سفیر مقرر کیا اور پھر دہلی جانے کا حکم ہوا۔ علامہ اسی سال سنہ ۶۲۴ھ میں دوبارہ ہندوستان کے لئے روانہ ہوگئے۔ علامہ کا یہ سفر ایک اہم تاریخی سفر تھا۔ علامہ خلیج

(۱) معجم الادباء یاقوت ص: ۹۵، جلد: ۳

(۲) ڈاکٹر محمد طفیل صاحب نے اپنے مضمون: ''امام محمد بن حسن صغانی کی خدمت حدیث'' میں علامہ کی تحریرات کے حوالہ سے اس کا ذکر کیا ہے: مجلہ فکر ونظر اسلام آباد اکتوبر، دسمبر ۱۹۹۹ء ص: ۴۷

عرب سے گزرتے ہوئے ہندوستان آئے اور گجرات اور ناگور کے راستے سے دہلی پہنچے۔علامہ، رمضان المبارک سنہ ۶۲۵ھ (اگست ۱۲۲۸ء) میں ناگور پہنچے تھے۔ناگور اور راستہ کی منزلوں پر قیام فرماتے ہوئے ۲۲؍ربیع الاول ۵۲۶ھ (جنوری ۲۹۔۱۲۲۸ء) کو دہلی پہنچے۔بادشاہ دہلی سلطان التمش نے سفارت بغداد کے استقبال کے لئے بہت اہتمام کیا۔سفارت وخلافت بغداد کا شایان شان اعلیٰ درجہ کا خیر مقدم کیا گیا۔پورے دہلی شہر کو سجایا سنوارا گیا اور اعلیٰ پیمانہ پر جشن منایا گیا۔خلیفۃ المسلمین نے التمش کے لئے خلعت بھیجا اور سلطنت دہلی کو ایک مستقل حکومت تسلیم کرلیا، (۱) جو سلطان دہلی کے لئے ایک بڑی کامیابی اور اعزاز تھا۔

خلیفہ بغداد کے نمائندوں اور سفیر کا دہلی آنا ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے، جس کا مؤرخین نے اہتمام سے ذکر کیا ہے۔اس سفارت کی سربراہی علامہ صغانی فرمارہے تھے۔

علامہ صغانی نے خلیفہ بغداد کی نمائندگی اور آداب سفارت کی تکمیل کے بعد غالباً رفقائے سفر کو رخصت کردیا ہوگا۔خود علامہ سات سال تک ہندوستان میں قیام فرمارہے۔بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ علامہ کی اس سفر سے ۶۳۷ھ میں واپسی ہوئی۔مگر ڈاکٹر سید رضوان علی نے لکھا ہے کہ علامہ نے اپنی کتاب التکملہ والذیل والصلہ کی تالیف کے اختتام پر، اس کی تاریخ تکمیل ۱۰؍صفر ۶۳۵ھ (اکتوبر ۱۲۳۷ء) جمعہ کے دن بیت اللہ کا دروازہ کھلنے کے وقت لکھی ہے (۲) یعنی اس وقت علامہ حرم شریف میں حاضر تھے، جو اس کا قطعی ثبوت ہے کہ علامہ ۶۳۷ھ سے کم از کم دو یا تین سال پہلے ہندوستان سے واپس ہوگئے تھے۔

علامہ نے سنہ ۶۳۵ھ سے پہلے اور بعد کے دو تین سال کہاں کس مصروفیت میں گزارے، اس کا علم نہیں۔مگر یہ اطلاعات ہیں کہ علامہ یمن ہوتے ہوئے سنہ ۶۳۷ھ میں بغداد واپس پہنچ گئے تھے۔اس کے بعد بغداد میں قیام فرمارہے۔

۱۹؍شعبان سنہ ۶۵۰ھ (غالباً ۲۵؍اکتوبر ۱۲۵۲ء) کو علامہ کی بغداد میں وفات ہوئی۔اپنے مکان حریم الطاہری (۳) میں عارضی طور پر دفن کئے گئے (۴) علامہ نے وصیت فرمائی تھی کہ مجھے مکہ مکرمہ میں دفن کیا

(۱) اس سفارت کا منہاج سراج نے طبقات ناصری میں ذکر کیا ہے۔ص اوّل اردو ترجمہ وحواشی غلام رسول مہر (لاہور)

(۲) لغوی نابغہ میں مدینہ لاہور، ڈاکٹر سید رضوان علی مجلہ الدراسات الاسلامیہ اسلام آباد

(۳) بعض جگہ اس کو حریم الظاہری لکھ دیا گیا ہے، جو صحیح نہیں، صحیح لفظ حریم الطاہری ہی ہے۔

(۴) علامہ شرف الدین ومیاطی اس حادثہ اور تدفین کے وقت حاضر تھے، انھوں نے اس کا ذکر کیا ہے۔

جائے اور جو شخص میری میت کو بغداد سے مکہ مکرمہ لے جائے، اس کو پچاس دینار بطور اجرت وشکریہ پیش کردیئے جائیں۔ دونوں وصیتوں پر عمل ہوا۔ علامہ کو ان کے مکان کی قبر سے نکال کر مکہ مکرمہ جنت المعلیٰ میں لے جاکر دفن کردیا گیا۔

علامہ صغانی کی ابتدائے نوجوانی سے ہی علمی پذیرائی شروع ہوگئی تھی۔ بڑے بڑے علماء علامہ کے عالی مرتبہ اور علمی کمال کے معترف تھے، جیسے جیسے زندگی کا سفر آگے بڑھتا رہا شہرت ومنزلت بڑھتی گئی۔ علامہ اپنی زندگی میں ہی دنیائے اسلام کے منتخب ترین علماء میں سے شمار کئے جاتے تھے۔ پایہ کے محدثین اور اہل کمال علامہ سے استفادہ کرتے تھے اور وقت کے برگزیدہ اور اہل لغت حلقہ درس وافادہ میں حاضر رہتے تھے۔

صغانی کے زمانہ حیات سے نامور مؤرخین اکابرین امت اور نامور محدثین غیر معمولی بلند الفاظ میں حضرت علامہ کا ذکر فرماتے آئے ہیں۔ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ مختصراً یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ علامہ ذہبی نے علامہ صغانی کا ''الشیخ الامام العلامہ المحدث، امام اللغۃ '' کے الفاظ سے تذکرہ شروع کیا ہے۔ جس میں یہ بھی لکھا ہے کہ: ''وکان الیہ المنتہیٰ فی معرفۃ اللسان العربی'' نیز برصغیر ہند کی برگزیدہ شخصیت، حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ جو ایک واسطہ سے امام صغانی کے شاگرد بھی ہیں۔ فرماتے تھے کہ:

''درآں ایام درحضرت دہلی علماء کبار بودند، باہمہ درعلوم متساوی بود''

علامہ صغانی کے زمانہ میں دہلی میں بڑے بڑے علماء موجود تھے،

علامہ تمام علوم میں بڑے علماء کے ہم پلّہ تھے۔

امادرعلم حدیث از ہمہ ممتاز وہیچ کس مقابل او بنود(۱)

مگر علم حدیث میں علامہ سب سے ممتاز تھے اور کوئی بھی عالم حدیث

میں علامہ کے پایہ کا نہیں تھا۔

علامہ صغانی کی جس خدمت یا کارنامہ نے علامہ کو خلعت دوام عنایت کی اور ان کا تذکرہ زندہ جاوید اور گویا لافانی کردیا، وہ علامہ کی تصانیف ہیں۔ علامہ نے اوائل عمر سے تصنیف وتالیف پر توجہ فرمائی اور زندگی کے آخری دنوں تک اس سے وابستہ رہے اور تصانیف کا ایک وسیع اور نہایت غیر معمولی ذخیرہ یادگار چھوڑا۔ علامہ کی یہ تصانیف عموماً حدیث وفقہ اور ادب ولغت کے موضوع پر ہیں جن کی تعداد اور شمار تو بہت زیادہ

(۱) فوائد الفواد فارسی (مجموعہ ملفوظات حضرت نظام الدین اولیاءؒ) ص:۱۰۴ نول کشور لکھنؤ:۱۳۰۲ھ)

نہیں، اہل نظر محققین کی اطلاعات کے مطابق تقریباً چالیس کتابوں کے نام ملتے ہیں۔ مگر ان میں اکثر وہ ہیں جو اپنے موضوع پر منفرد اور ملی اسلامی کتب خانہ کا ایک ممتاز اور قابل فخر حصہ سمجھی جاتی ہیں۔

علامہ صغانی اگر ایک جانب ساتویں صدی ہجری کے ممتاز ترین اور مایہ ناز محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں تو دوسری طرف دنیائے اسلام کے گنتی کے چند ماہرین لغت میں سرفہرست ہیں اور یہ فیصلہ کرنا بھی آسان نہیں کہ علامہ کا محدث کی حیثیت سے بڑا مرتبہ ہے، یا لغت داں کی حیثیت سے۔ لغت کی کتابوں سے استفادہ کرنے والے یہ سمجھتے ہیں کہ شاید اس پایہ کا دوسرا لغت داں نہ ہو اور جو علامہ کی خدمات حدیث سے واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ علامہ کی خدمات حدیث کو اُمّت کے لئے بڑا تحفہ اور قابل فخر سرمایہ سمجھتے ہیں۔

علامہ کی دریافت تصانیف میں سے بائیس لغت پر ہیں، بارہ حدیث شریف پر، تین فقہ اور دیگر موضوعات پر۔ علامہ کی لغت کی کتابوں کا امتیاز یہ ہے کہ وہ دنیائے اسلام کے لغوی ذخیرہ کی گویا بنیاد اور اساس ہیں۔ دنیا کے اہل نظر لغت داں، علامہ صغانی کی کتابوں کی موجودگی میں متأخر تصنیفات ومؤلفین کو چنداں اہمیت نہیں دیتے، جس کا کچھ اندازہ اس سے ہوگا کہ علامہ ابن منظور افریقی کی شہرۂ آفاق تالیف لسان العرب دنیائے عرب کی اہم اور ممتاز ترین لغت سمجھی جاتی ہے مگر اہل نظر اور محققین کا خیال ہے کہ علامہ صغانی کی کتب لغات کی موجودگی میں اس کی کچھ اہمیت نہیں۔ برصغیر کے بڑے فاضل اور عربی کے مایہ ناز محقق اور ماہر لغت، علامہ عبدالعزیز میمن فرماتے تھے کہ:

"امام صغانی لاہوری اعلیٰ ترین پائے کا لغوی تھا۔ مولف لسان العرب اس کا ہم عصر تھا لیکن لسان العرب کا مصنف کوئی اعلیٰ لغوی نہیں تھا۔ اس نے صرف چار کتابیں جمع کر دی ہیں، کتاب غلطیوں سے بھری ہوئی ہے"۔(۱)

علامہ میمن نے اسی سلسلۂ گفتگو میں یہ بھی کہا ہے کہ:

"مجدالدین فیروزآبادی نے القاموس میں صغانی کی کتابوں پر ڈاکہ ڈالا ہے"۔(۲)

(۱) محاضرات میمنی افادات علامہ عبدالعزیز میمن۔ مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مشمولہ مجلہ تحقیق، مدیر ڈاکٹر نجم الاسلام، جام شورو، سندھ (شمارہ: ۱۱۔۱۰ ام۔۹۷۔۱۹۹۶ء) ص: ۱۰۰

(۲) محاضرات میمنی، علامہ عبدالعزیز میمن، مرتبہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ص: ۱۰۰۔۔۔ مشمولہ مجلہ تحقیق، حیدرآباد، سندھ شمارہ: ۱۰۔۱۱ (۹۷۔۱۹۹۶ء)

اگر علامہ میمن کے مذکورہ فقرہ کے ساتھ مولانا مناظر حسن گیلانی کے یہ کلمات بھی شامل کر لئے جائیں تو بات مکمل ہو جاتی ہے کہ:

''صغانی کی کتاب رہ گئی اور فیروز آبادی کا کام چل نکلا''(۱)

اور اس پر تمام اہل نظر کا اتفاق ہے کہ علامہ صغانی نے عربی لغت پر جو کام کیا ہے وہ بے مثال ہے۔ اس کے بعد عربی لغت پر اس پایہ کا کوئی کام نہیں ہوا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ صغانی سے پہلے بھی اس طرح کے لغوی کام کی مثالیں بہت کم ہیں۔

علامہ کی لغت پر بیس سے زائد کتابیں معلوم اور دستیاب ہیں، جن میں سے اکثر شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں بڑی ضخیم مجلدات کے علاوہ متعدد مختصر رسالے بھی ہیں۔ یہ رسالے اختصار اور چند صفحات پر مشتمل ہونے کے باوجود اپنے موضوع کی اہم ترین مصنفات میں شمار کئے جاتے ہیں اور اپنے اپنے مباحث پر دستاویز اور سند کی حیثیت رکھتے ہیں۔

علامہ کی لغت پر بڑی کتابوں میں: العباب الزاخر واللباب الفاخر سرفہرست ہے(۲) جو اسلامی علمی کتب خانہ کا مایہ ناز سرمایہ اور ممتاز ورثہ ہے۔ العباب الزاخر کی تدوین سے پہلے علامہ نے عربی لغت پر دو بڑی کتابیں اور مرتب فرمائی تھیں۔ التکملہ والذیل والصلة جو جوہری کی تاج اللغة اور صحاح کا خلاصہ اور انتخاب ہے۔ اس کے بعد مجمع البحرین مرتب فرمائی، جس میں التکملة اور جوہری کی دونوں کتابیں یک جا کی گئی ہیں۔ ان کے بعد اپنی بڑی معرکہ آرا تصنیف العباب تصنیف فرمائی، اس کا کام مکمل نہیں ہوا تھا، حرف میم تک پہونچے تھے کہ پیغام اجل آ گیا اور یوں یہ بڑی کتاب نامکمل رہ گئی۔

علامہ کے لغوی کارنامے فقید المثال ہیں، مگر ان کی خدمات حدیث بھی علمی مرتبہ وافادیت کے لحاظ سے کچھ کم نہیں۔ شیخ شرف الدین الدمیاطی کا قول ہے کہ صغانی لغت، فقہ اور حدیث تینوں کے امام تھے۔

پچاس سال درس وافادہ اور بے نظیر شاگردوں کے علاوہ، علامہ کی تصنیفی تدوینی خدمات میں خدمت

---

(۱) ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت۔ مولانا گیلانی ص:۱۵۲۔ جلد:۲ (دہلی: ۱۹۸۱ء)

(۲) العباب الزاخر، پاکستان کے عربی زبان کے ممتاز فاضل اور باریک بیں محقق، پیر محمد حسن نے بہت مہارت اور دقت نظر سے مرتب کیا تھا، جس کی چند جلدیں اسلامک یونیورسٹی (اسلام آباد، پاکستان) کے شعبۂ مطبوعات نے شائع کی تھیں مگر یہ جلدیں طباعتی غلطیوں کی وجہ سے واپس لے لی گئیں، سنا ہے کہ دوبارہ عمدہ صحیح نسخہ چھپ گیا ہے۔ واللہ اعلم۔

حدیث کے دوشاہ کار نہایت غیر معمولی اور ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں، ان کی وجہ سے حدیث کا ہر ایک استاذ اور طالب علم حضرت امام کا ممنون احسان ہے۔

پہلا بڑا اور نادر روزگار کارنامہ بخاری شریف کے نسخوں کا مقابلہ فرما کر، اس کا ایک محقق نسخہ مرتب فرمانا ہے۔ بخاری شریف کے متعدد روایتوں پر مبنی مختلف نسخے تھے، جو علیحدہ خطوں وعلاقوں میں بکھرے ہوئے تھے، جس کی وجہ سے صحیح بخاری کا ایک معتمد محقق نسخہ مرتب کرنے کی بڑے علماء اور محدثین نے کوشش فرمائی ان میں سے دو نسخے آخری مکمل صحیح ترین نسخے شمار کئے جاتے ہیں۔ علامہ صغانی کا اور علامہ شیخ شرف الدین یونینی کا۔ اہل علم نے لکھا ہے کہ:

> ''عرب، ہند فارس اور عراق میں صحیح بخاری کے جو ایڈیشن مقبول ومروج ہیں، وہ صغانی کے مرتب کردہ متن پر مبنی ہیں اور یونینی کا مرتب کردہ ایڈیشن مراکش، الجزائر، مصر اور شام میں مقبول ہے(۱)

نسخۂ صحیح بخاری کی تدوین کے بعد دوسرا کارنامہ مشارق الانوار کی تالیف ہے۔ مشارق کے علاوہ علامہ کی حدیث شریف پر بارہ مؤلفات وکتب معلوم ہیں۔ معروف کتابوں میں موضوعات پر رسالہ سرفہرست ہے۔ اگرچہ اس رسالہ میں درج بعض احادیث کے موضوع ہونے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا مگر اس میں شک نہیں کہ اس میں علامہ نے بعض اصول بہت واضح طور پر بیان کئے ہیں۔ خصوصاً وضاعین حدیث اور معمرین پر جو گفتگو کی ہے، وہ اس پہلو سے غالباً سب سے پہلی بحث ہے۔

ایک اور رسالہ حضرت ابوامامہ کے حوالہ سے، قرآن کریم کی سورتوں کے فضائل کی تحقیق اور ان کے موضوع ہونے کے ذکر میں ہے۔

ایک اور کتاب **کشف الحجاب عن احادیث الشھاب** ہے۔ یہ علامہ شہاب قضاعی کی **مسند الشھاب** کی تہذیب وترتیب ہے، جس میں مسند شہاب کی تمام روایتوں کے سامنے صحیح یا موضوع کی علامت لگا کر اس کے مرتبہ کو واضح کیا ہے۔

علامہ نے صحیح بخاری کی شرح بھی لکھنی شروع کی تھی مگر پورا نہ کرسکے، اس کی ایک جلد معلوم ہے۔

علامہ صغانی کی ایک اور تالیف **درالسحابہ فی مواضع وفیات الصحابہ** ہے۔ ایک کتاب

(۱) علم حدیث میں برصغیر ہندوپاک کا حصہ، تالیف ڈاکٹر محمد اسحاق، ترجمہ شاہد حسین رزاقی ص:۲۲۹ (لاہور: ۱۹۷۷ء)

الضعفاء والمتروکین ہے، الدر الملتقط میں شہاب قضاعی کی کتاب اور محمد بن اقلیشی کی النجم میں درج موضوع روایات کا ذکر ہے۔ تبیین الموضوعات کے نام سے موضوعات پر ایک رسالہ اور ہے۔ حدیث اور متعلقات حدیث پر اس کے علاوہ اور بھی چھوٹے بڑے رسائل اور تالیفات ہیں۔ علامہ کی تصانیف میں کم سے کم تین کتابیں فقہ پر، تین چار کتابیں تاریخ وغیرہ متفرق موضوعات پر ہیں، مگر اس سرمایہ میں سے جس کتاب کو بقائے دوام کی خلعت اور افادہ عام کا تاج زرنگار میسر ہوا، وہ مشارق الانوار ہے۔

مشارق الانوار صحیحین، بخاری ومسلم کی احادیث شریفہ کا نہایت جامع انتخاب ہے۔ یہ مصنف یا تالیف یا جمع بین الصحیحین، مصنف کے غیر معمولی حافظہ، رسائی ذہن اور جدت واختراع کی نادر یادگار ہے۔ علامہ صغانی نے علامہ محمد بن احمد اقلیشی کی کتاب النجم اور شہاب قضاعی کی مسند کا علیحدہ علیحدہ انتخاب کیا تھا، بعد میں اس انتخاب سے بہتر زیادہ مفید اور جامع ترین کتاب کی تصنیف کا خیال آیا۔ اس وقت علامہ کی نگاہ انتخاب صحیحین کے خلاصہ پر گئی۔ علامہ نے اسی لئے مشارق الانوار کی تالیف کا آغاز فرمایا تھا، جس میں مصنف نے ایک خاص ترتیب کے ساتھ صحیحین کی روایتیں پیش فرمائی ہیں۔ احادیث صحیحین کے بعد اقلیشی اور شہاب قضاعی کی صحیح روایتیں بھی کہیں کہیں درج فرمائی ہیں، مگر مؤخر الذکر کتابوں کی صرف وہی روایتیں لی گئی ہیں۔ جن کی صحت پر علامہ صغانی کو پورا پورا اطمینان تھا اور ان کو پوری طرح جانچ پرکھ لیا تھا۔

مشارق الانوار میں صرف قولی احادیث لی گئی ہیں، فعلی روایات شامل نہیں کی گئیں۔ اس کا بھی اہتمام کیا گیا کہ صرف اصل احادیث شامل ہوں، شواہد اور واقعات وروایات بالمعنی کو ترک کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد جدت کی گئی ہے کہ احادیث کو ابواب فقہیہ یا صحیحین اور احادیث شریف کی معروف کتابوں کی ترتیب پر مبنی نہیں کیا گیا، بلکہ اس مجموعہ کی اساس عوامل نحو پر کی گئی ہے، جس کا آغاز من شرطیہ سے ہوا ہے۔ پہلی روایت یہ ہے:

من اٰمن باللہ وبرسولہ واقام الصلوٰۃ وصام رمضان کان حقا علی اللہ ان یدخلہ الجنۃ

پوری کتاب میں آخر تک یہی ترتیب ہے، مرتب نے عوامل نحو یہ کی خاص ترتیب کا خیال رکھتے ہوئے کتاب کو بارہ ابواب میں منقسم کیا ہے۔ ان میں سے چند باب فصول پر بھی تقسیم ہیں اور ہر ایک فصل اس طرح مرتب کی گئی ہے کہ ہر ایک عامل لفظ کے مختلف معنی ایک ہی فصل میں واضح ہو جائیں۔ مثلاً لفظ من بمعنی

استفہام موصولہ اور جو عامل مختلف متصل ضمیروں کے ساتھ آتے ہیں، ان کو بھی الگ الگ کر دیا ہے۔ جیسے انہ، انک، انی وغیرہ۔ مزید برآں اس باریک بینی اور ترتیب کے ساتھ ہی حروف تہجی پر بھی مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مشارق الانوار احادیث شریفہ کے ذخیرہ میں اپنی نوعیت کی کتابوں میں منفرد ہے اور خاص اہل علم کے لئے اس کے فائدے بھی بہت ہیں کہ اگر حدیث شریف کا پہلا حرف یاد ہو تو اس حدیث شریف کا اس مجموعہ یا تصنیف میں تلاش کرنا بہت آسان ہے، گویا یہ کتاب صحیحین کا اشاریہ بھی ہے۔

مشارق الانوار اگرچہ صحیحین کی احادیث کا انتخاب ہے مگر علامہ مصنف نے تمام احادیث کو جوں کا توں نقل نہیں کیا۔ ان کی سندیں حذف کر دی ہیں، صرف صحابی کا نام ذکر کیا ہے اور بعض مقامات پر اپنی ترتیب اور ضرورت کے لحاظ سے حدیث کا انتخاب یا تقسیم بھی کی ہے۔ کہیں کہیں ایک روایت یا حدیث کا ایک حصہ ایک موقع پر، دوسرا جزیا حصہ دوسرے موقع پر ذکر کیا ہے۔ چند حدیثوں کو تین تین حصوں میں علیحدہ علیحدہ بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً الفصل التاسع کے آخر میں ام حرام بنت ملحانؓ کی ایک روایت ہے:

”اوّل جیش من امتی یغزون البحر قد اوجبوا اول جیش من امتی یغزون مدینة قیصر مغفور لھم“

مگر سہو وخطا لازمۂ بشریت ہے، اس لئے مشارق کے حوالوں میں بھی مصنف سے چند جگہ فروگذاشت ہوگئی ہے۔ حضرت امام نے بعض احادیث کے لئے صحیحین یا دونوں میں سے کسی ایک کا حوالہ دیا ہے مگر وہ روایتیں صحیحین کی نہیں ہیں اور بعض جگہ صحیحین میں سے ایک دوسرے کا حوالہ تبدیل ہوگیا۔ مثلاً آغاز کتاب پر ہی دوسری روایت حضرت زید بن خالد جہنیؓ کے حوالہ سے ہے:

اس کے لئے مصنف نے صحیحین کا رمز لکھا ہے مگر یہ روایت صرف صحیح مسلم میں ہے۔ بخاری شریف میں نہیں ہے۔ اور بھی چند روایتیں ایسی درج ہوگئی ہیں جو صحیحین میں نہیں ہیں، مثلاً روایت: ۲۱۲ جس کے لئے مصنف نے صحیح مسلم کا حوالہ دیا ہے مگر یہ روایت نہ بخاری میں ہے نہ مسلم میں، بلکہ ترمذی ابن ماجہ اور مسند احمد کی روایت ہے۔ اس کے حوالہ میں مصنف کو سہو ہوا۔

اسی طرح حدیث: ۸۹۴ کے لئے صحیحین کا حوالہ دیا ہے مگر یہ روایت صرف صحیح بخاری کی ہے۔ صحیح مسلم میں

نہیں ہے۔ نیز حدیث: ۱۴۵۴ جو امام صغانی نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے صحیح بخاری سے نقل کی ہے، نسبۃً ثانوی مراجع قضاعی کے مسند شہاب یا ابن معین کی تاریخ وغیرہ میں ہے مگر یہ ایسی معمولی فروگذاشتیں ہیں جن سے کوئی بھی انسانی کتاب خالی نہیں ہے۔ ان فروگزاشتوں کی وجہ سے اس عظیم وجلیل کتاب اور اس کے فخر اقران مصنف پر کوئی حرف نہیں آتا۔

مشارق الانوار کو حق تعالیٰ نے خاص مقبولیت سے نوازا ہے، یہ کتاب مصنف کی زندگی میں ہی مشہور ہوگئی تھی۔ اور علامہ کی زندگی میں ہی اس کی شروحات، حاشیوں کی ترتیب وتلخیص کا کام شروع ہوگیا تھا۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی علماء کی مصنفات میں سے حدیث کی غالباً کوئی اور کتاب ایسی نہیں ہے جس کی اس بڑے پیمانے پر صدیوں تک یوں مسلسل خدمت انجام دی گئی ہو اور اکابر علماء اور محدثین نے اس کی اس قدر شروحات لکھی ہوں یا اس پر کسی اور عنوان سے اس قدر توجہ فرمائی ہو۔

مشارق الانوار کی شرحیں کثرت سے لکھی گئیں۔ ان شروحات کی بھی تلخیص ہوئی۔ ان پر حاشیے لکھے گئے، ان کے تکملے مرتب ہوئے اور بعض علماء نے ان شروحات کو بھی اپنی ترتیب کے مطابق مرتب ومدون کیا۔ اور اصل مشارق الانوار کو بھی کئی علماء نے مرتب فرمایا۔ بعد میں ان کی ترتیبات پر اور کام ہوا۔ ان کی بھی شرحیں مرتب ہوئیں۔ مشارق الانوار کے متعدد غالباً بارہ تیرہ خلاصے مرتب کئے گئے۔ اس طرح مسلسل چراغ سے چراغ جلتے رہے۔

مشارق الانوار کی سب سے پہلی شرح شیخ وجیہ الدین عبدالرحمان بن محمد بن عبدالعزیز ارزنجانی (وفات سنہ ۶۴۳ھ/۱۴۴۵ء) کی تالیف حدائق الازھار ہے۔ اس کے بعد عبداللطیف بن عبدالعزیز کرمانی (وفات تقریباً ۸۰۰ھ/۱۳۹۷ء) کی مبارق الازھار: خضر بن محمود زرقانی کی کشف المشارق، علامہ مجدالدین فیروزآبادی مؤلف قاموس (۸۱۷ھ) کی شرح شراق الانوار کے علاوہ، شروحات کی بڑی تعداد ہے۔

ہندوستانی علماء نے بھی مشارق الانوار کی عربی فارسی اور اردو میں کئی شروحات مرتب فرمائیں، جن میں سے دو شرحیں نامور مرشد اور شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے مسترشد، سید گیسودراز (محمد بن یوسف دہلویؒ) دفین گلبرگہ، وفات (ذی قعدہ، ۸۲۵ھ) کی ہیں۔ سید گیسودراز نے عربی وفارسی علیحدہ علیحدہ دو شرحیں لکھیں، عربی کی شرح تصوف کے پیرہن میں ہے، فارسی شرح محدثانہ طرز پر ہے۔

نیز شیخ محمد منور لاہوری اور سید احمد عریضی کڑوی (کڑا ضلع مانکپور) نے بھی مشارق کی شروحات تحریر فرمائی ہیں۔

تحفۃ الاخیار اور اس کی معنویت

اردو میں مشارق کے جو ترجمے ہوئے یا دیگر شروحات لکھی گئیں، ان میں ممتاز ترین خدمت اور اعلیٰ درجہ کی مگر مختصر شرح، مولانا خرم علی بلہوری (بلہور ضلع شاہ جہاں پور) وفات ۱۲۷۳ھ (۵۴۔۱۸۳ء) کی تحفۃ الاخیار مؤلفہ ۱۲۴۹ھ (۳۴۔۱۸۳۳ء) ہے۔

یہ شرح ہندوستان کی لسانی نثری تاریخ میں بھی خاص درجہ رکھتی ہے اور حدیث شریف کی بڑی معتبر کتاب کی اردو میں پہلی شرح اور مکمل اردو ترجمہ ہے۔ اس سے قطع نظر بھی یہ شرح یا تصنیف برصغیر کے علمائے کرام اور دینی طبقہ کے لئے ایک گراں قدر تحفہ ہے۔ مترجم اور شارح نے مشارق الانوار کا سادہ مگر مطلب خیز ترجمہ کیا ہے، جس کو مترجم مرادی ترجمہ کہتے ہیں۔ ترجمہ کے ساتھ ضروری فوائد یا مختصر تشریح بھی ہے۔

تحفۃ الاخیار میں سے مشارق الانوار کی ترتیب پر متن حدیث ہے، پھر اس کا اردو ترجمہ ہے، آخر میں ف کا نشان لگا کر اس کی ضروری تشریح فرمائی گئی ہے، جس میں عوام کے فہم و مذاق کا خیال رکھتے ہوئے اہم اور ضروری مطالب پر توجہ کی گئی ہے۔ اکثر افادات میں مشارق کے علاوہ اور احادیث کا ترجمہ نقل کر کے کتاب کے فوائد کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ فوائد مختصر اور مفصل دونوں طرح کے ہیں، بیشتر مختصر ہیں۔

مؤلف مشارق نے حدیث شریف کے لئے جو حوالے دئے ہیں، بخاری یا مسلم یا دونوں کے، مترجم نے دونوں کتابوں سے ایک ایک حدیث کی مراجعت کی ہے اور خود تحقیق کر کے علامہ صغانی کی اطلاع کی توثیق کی ہے اور اگر علامہ کے رموز و اطلاع میں کہیں سہو ہو گیا ہے تو مولانا خرم علی نے اس کی صراحت فرما دی ہے۔ مثلاً آغاز کتاب پر حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے، جس پر تمام نسخوں میں ف کا نشان ہے یعنی یہ حدیث صحیحین بخاری و مسلم دونوں میں ہے، مگر اس میں حضرت مصنف کو سہو ہوا یا سہو کاتب ہے، بہر صورت یہ صحیح نہیں، یہ روایت صرف صحیح مسلم میں ہے، مولانا خرم علی صاحب نے ایسی فروگذاشتوں پر توجہ دلاتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ:

"اکثر مشارق کی کتابوں میں اس حدیث پر قاف کی علامت ہے، یعنی بخاری اور مسلم

دونوں میں یہ حدیث بالاتفاق ہے، حالانکہ یہ صاف خطا ہے، اس واسطے کہ صاحب جامع الاصول اور شارح گارزونی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث صرف مسلم میں ہے۔ بخاری میں نہیں ہے اور اس عاجز نے بھی صحیح بخاری میں دیکھا، زید بن خالد سے اس میں اس مضمون کی حدیث نہیں پائی، معلوم ہوا کہ کاتب کی غلطی ہے"۔

اس طرح روایت نمبر: ۴ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی ہے، جس کے لئے مشارق کے نسخوں میں م کا نشان ہے، یعنی یہ حدیث صرف صحیح مسلم میں ہے مگر یہ بھی درست نہیں، یہ روایت متفق علیہ ہے۔ مولانا بلہوری نے لکھا ہے کہ:

"یہ حدیث بخاری اور مسلم دونوں میں ہے۔ اکثر نسخوں میں اس حدیث پر م یعنی صرف مسلم کی علامت ہے ،سو غلط ہے"۔

مولانا خرم علی مشارق الانوار کے ترجمہ یا تحفۃ الاخیار کی تالیف سے ۱۲۴۹ھ (۳۴-۱۸۳۳ء) میں فارغ ہوئے تھے۔ مولانا نے کتاب کے آغاز میں اس کا صاف لفظوں میں یوں ذکر فرمایا ہے:

"الحمد للہ کہ بارہ سوانچاس میں حسب دل خواہ ترجمہ ہوا، اور تحفۃ الاخیار ترجمہ مشارق الانوار اس کا نام مقرر کیا"۔

تحفۃ الاخیار سب سے پہلے حاجی محمد حسین لکھنؤ کے مطبع سے ۱۲۵۴ھ میں چھپی تھی۔ اس کے بعد ان کے بھائی محمد مصطفیٰ نے ۱۲۶۷ھ میں شائع کی اور بھی ایڈیشن نکلے۔ ایک ایڈیشن مطبع نظامی کانپور نے شائع کیا تھا۔ مطبع نظامی کی ایک طباعت جو سنہ ۱۲۹۱ھ میں آئی تھی بہت ممتاز اور بے مثال طباعت ہے۔ اس اشاعت میں تحقیق، فہرست سازی، احادیث کا نمبر شمار اور وہ لوازم موجود ہیں۔ جو یورپ کی ایجاد اور عصر حاضر کا سرمایہ سمجھے جاتے ہیں۔

مطبع نظامی کانپور کے چھپے ہوئے اس نسخہ کے آغاز پر، عوامل نحویہ کی ترتیب کے مطابق، ایک نہایت جامع اور مفصل فہرست ہے، جو گویا ایک علیٰحدہ مستقل گران قدر تالیف ہے۔ یہ مولانا الٰہی بخش فیض آبادی کی یادگار ہے۔ مولانا فیض آبادی نے اپنی اس فہرست کو "تبصرة الابصار فی تخریج الآثار" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

یہ فہرست، تین کالمی صفحہ اور اکیس سطری مسطر کے، چونتیس صفحات پر آئی ہے، مرتب فہرست مولانا الٰہی بخش فیض آبادی نے اس فہرست کی ترتیب میں اس قدر محنت، جگر کاوی اور باریک بینی سے کام لیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

فہرست کا ایک کالم چھ خانوں یا عنوانات پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلے یہ واضح کیا ہے کہ مرتب کی ترتیب کے مطابق اس باب کا نمبر شمار کیا ہے؟ پھر یہ واضح کیا گیا ہے کہ اس کی عوامل نحویہ کے کس فعل سے ابتداء ہوئی ہے؟ پھر یہ واضح کیا گیا کہ یہ روایت صحیحین کی ہے یا صحیحین میں سے کسی ایک کتاب کی؟ پھر اس حدیث کا نمبر شمار درج کیا گیا۔ بعد ازاں راوی حدیث صحابی کا اسم گرامی رقم ہے۔ آخر میں اس حدیث کا فقرۂ آغاز ہے۔ اس طرح آخر تک ایک ایک حدیث کی وضاحت ونشاندہی فرمائی گئی ہے، جو بلاشبہ غیر معمولی کام ہے۔

اور اس نہایت نازک ترتیب میں بھی ابواب فقہیہ حدیثیہ کی ایک لطیف رعایت رکھی گئی ہے۔ پہلا باب من شرطیہ کا ہے۔ اس باب کے ذیل میں ایمان کی حدیث لائے ہیں۔ ترتیب یہ ہے:

باب تصحیح النیة، کتاب الایمان ، باب الکبائر، باب علامات النفاق ؛

باب الوسوسه، باب الایمان بالقدر، باب اثبات عذاب القبر.

لیکن حضرت مصنف اور فاضل علام فہرست نگار کا کام یہیں ختم نہیں ہوا، بلکہ اول حضرت مترجم نے اپنے سامنے موجودہ نسخہ مشارق کا کئی قلمی نسخوں سے مقابلہ کیا ہے اور اس نسخہ کی طباعت کے بعد مولانا الٰہی بخش نے دوبارہ قلمی نسخوں سے مراجعت کی اور اگر مولانا خرم علی صاحب کے کام میں کہیں کوئی بات رہ گئی تھی تو اس کی تصحیح کردی ہے، مگر کئی موقعوں پر مولانا خرم علی اور مصحح ثانی مولانا الٰہی بخش فیض آبادی کی نظر بھی چوک گئی اور متعلقہ غلطی پر تنبیہ نہیں فرمائی۔ مولانا فیض آبادی نے پوری کتاب کی تمام احادیث کے حاشیہ پر نمبر شمار درج کردیا ہے، جس کا اختتام دو ہزار دو سو انہتر پر ہوا ہے، یعنی مشارق الانوار میں کل ۲۲۶۹، احادیث درج ہیں۔

یہ تعداد اس شمار سے زیادہ ہے جو مشارق الانوار کے مشہور شارح علامہ گاذرونی نے ذکر فرمائی ہے۔ مشارق کی روایات کے شمار میں گاذرنی کا قول عموماً نقل کیا جاسکتا ہے، علامہ گاذرنی نے اپنی شرح مشارق میں ہر ایک باب کے اختتام پر اس باب کی احادیث کا شمار درج کیا ہے، اور آخر میں جملہ احادیث کا۔

گاذرنی کا قول ہے کہ مشارق میں کل دو ہزار دو سو چھیالیس احادیث ہیں۔ اس اشاعت کے شمار کے

مطابق تئیس احادیث مذکورہ شمار سے زیادہ ہیں، اور مشارق کا جو محقق ایڈیشن اشرف بن عبدالمقصود کی تخریج و تعلیق سے، سنہ ۱۴۰۹ھ (۱۹۸۹ء) میں بیروت میں چھپا ہے، اس میں بھی یہی تعداد ہے جو مولانا الٰہی بخش نے رقم فرمائی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ گاذرنی کے نسخہ میں غالباً چند روایات رہ گئی تھیں۔ یہ فہرست ایسی قابل قدر ہے کہ مشارق کے نسخوں کی ترتیب وتدوین اوران سے استفادہ کے لئے ایک کلید کی حیثیت رکھتی ہے۔

تحفۃ الاخیار چوں کہ مؤلف مشارق الانوار کی ترتیب کے مطابق ہے، مگر طالب علم اور عام پڑھنے والے اس میں اپنی ضرورت کی روایتیں تلاش کرنے میں قاصر رہتے تھے، اس لئے مولانا عبدالغفور بن محمد بن عبداللہ غزنوی نے تحفۃ الاخیار کو ابواب فقہ کی ترتیب پر مرتب کر کے اس کا نام مشکوۃ الانوار رکھا جس میں تحفۃ الاخیار یا مشارق کی ترتیب احادیث کی اس طرح رعایت رکھی گئی ہے کہ مشارق میں جس حدیث پر جو نمبر شمار پڑا ہوا ہے، وہ اپنی اس کتاب مشکوٰۃ الانوار میں حاشیہ پر درج کر دیا اور اس کتاب کو ابواب فقہ کی ترتیب پر مرتب کیا۔ مشکوٰۃ الانوار تقریباً چھ سو بتیس صفحات پر مشتمل ہے، پہلی مرتبہ مطبع فاروقی دہلی سے ۱۳۰۸ھ میں چھپی تھی۔

جلیل القدر عالم، محدث، فقیہ، مدرس، محقق، مصنف، حاشیہ نگار اور مصلح

حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ

دورِ تعلیم وتلمذ

[زیر قلم سوانح کے چند اوراق]

نورالحسن راشد کاندھلوی

سہارنپور ہندوستان کے ایک بڑے صوبہ، یوپی کی پہلی تقسیم کے بعد، نئے شمالی سرحدی صوبہ اترانچل کی سرحد سے ملتا ہوا، مغربی یوپی کا آخری سرحدی ضلع اور بڑا شہر ہے، یہی اس ضلع کا صدر مقام ہے۔ سہارنپور کی قدیم آبادی کا معتبر حال معلوم نہیں، لیکن اس نواح کے متعدد اہم قصبات اور بستیوں کی طرح اس کی بنیاد بھی عہد سلطنت میں پڑی، کہا جاتا ہے کہ سلسلہ چشتیہ کے ایک درویش یا شیخ، شاہ محمد ہارون یہاں ایک ندی کے کنارے جھونپڑی ڈال کر آ بیٹھے تھے، یہ جگہ وہ تھی جس کے برابر میں ایک پرانا منہدمہ قلعہ تھا، یہ جگہ محلّہ کوٹ تلہ (یعنی قلعہ کے نیچے کا حصہ) کے نام سے مشہور ہے۔ شیخ ہارون کی نسبت ان کے وابستگان کو منتقل ہوئی اور یوں چراغ سے چراغ روشن ہوتے ہوئے ایک بستی آباد ہوگئی جو شیخ ہارون کی وجہ سے شاہ ہارون پور کے نام سے مشہور ہوئی اسی کو سہارنپور کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اب موجودہ ہندوستان کے بعض خاص ذہن کے لوگوں کے منصوبہ بلکہ سازش کے تحت اس کو کسی راجہ سے منسوب کیا جارہا ہے۔ بہرحال یہ تقریباً چھ سو سال پرانا شہر ہے، قدیم تاریخوں میں اس کا حال نہیں ملا مگر عہد مغلیہ میں اس کو اہمیت حاصل ہوگئی تھی، بعد میں اس میں اضافہ ہوتا رہا، خصوصاً اورنگ زیب عالم گیر کے بعد کے مآخذ میں اس کا نسبتہً زیادہ ذکر ملتا ہے۔

جیسا کہ اس زمانہ کا معمول تھا کہ عرب، ایران وافغانستان اور دوسرے خطوں سے، معزز علماء بڑے مشائخ اہل فضل وکمال اور عہدہ ومنصب کے طلب گار کثرت اور تواتر کے ساتھ ہندوستان آتے

رہتے تھے، اور قدر شناس حکمراں، وزراء اور امراء آنے والوں کو مختلف مقامات کی امارت قضات اور مناسب عہدوں سے نوازتے رہتے تھے، ان کی یہ خدمت، فیاضی اور علم پروری، دوسرے علماء اور اہل کمال کے لئے وجہ کشش بن جاتی تھی۔ یوں علماء اور مشائخ وغیرہ کے ہندوستان خصوصاً دہلی اور اس کے اطراف میں آنے اور قیام فرمانے کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا۔ بعد میں ان کی اولادیں اور نسلیں خوب پھلی پھولیں اور بڑھیں، یہاں تک کہ پوری بستیاں اور کئی کئی گاؤں ان کی ذریت سے لبریز ہوگئے۔ سہارنپور اور اس کے نواح کے پرانے قصبات میں (جن میں سے اکثر کی آبادی اور مشائخ وعلماء سے نسبت سہارنپور کے قائم وآباد ہونے سے صدیوں پہلے کی ہے) بھی ایسے بیسیوں حضرات آئے جن کے اخلاف اور دینی علمی تعلیمی سلسلے مدت تک متحرک اور رواں دواں رہے۔ خصوصاً ان کی دینی خدمات وسلامتی کے کچھ اثرات ونشانات نیز بعض کی جاگیریں اور مکانات تک تقریباً سنہ ۱۹۴۷ء تک کسی حد تک قائم رہے، بعد میں یہ سلسلہ تقریباً درہم برہم ہوگیا۔

ایسے چند قدیم خاندانوں میں جنہوں نے سہارنپور شہر میں قیام کیا اور اس کو اپنا وطن بنالیا، وہ قدیم انصاری خاندان بھی ہیں جن کا رشتہ نسب انصارِ مدینہ (علی صاحبہا الصلاۃ والسلام) سے جڑا ہوا ہے۔ تمام تفصیلات میری دسترس میں نہیں، جو مختصر معلومات دستیاب ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم انصار کی تین شاخیں جن کا سلسلہ بھی علیحدہ ہے، نویں صدی ہجری سے بارہویں صدی ہجری کے آخر تک وقفہ وقفہ سے سہانپور آئیں اور وہیں مقیم ہوگئیں، جن میں ایک خاندان وہ ہے جو شیخ ابوسعید انصاری کی نسبت سے مشہور ہے۔ اسی خاندان کے آخری سلسلوں میں حضرت مولانا احمد علی محدث کا گھرانہ بھی تھا، سراج النسب میں لکھا ہے:

> ”آپ کا نسب نامہ حضرت شیخ الاسلام ابوسعید انصاری عرف شیخ جوہرا گراہوی تک پہنچتا ہے اور یہ حضرت قطب العالم عبدالقدوس گنگوہی کے خلیفہ ہیں۔ مکتوبات قدسیہ میں جو چوالیسواں مکتوب ہے وہ آپ ہی کے نام ہے، اور اسی خاندان میں عالم ربانی حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری۔۔۔۔۔ الخ (۱)

---

(۱) سراج النسب مرتبہ سراج الحق سرساوی (سرساوہ ضلع سہارنپور) ص:۹۶ (قادیان: ۱۳۱۳ھ) سراج النسب کے مؤلف سراج الحق، شیخ جمال ہانسوی کی اولاد میں اور اس خانقاہ کے خانوادۂ سجادہ نشینان میں تھے مگر بدنصیبی سے قادیانی ہوگئے تھے اور قادیان جاکر بس گئے تھے، اس لئے یہ کتاب قادیان سے چھاپی تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ سراج الحق قادیانیت سے تائب ہوکر واپس آگئے تھے۔ واللہ اعلم

شیخ ابوسعید انصاری

شیخ ابوسعید عرف شیخ چوہر کے مفصل احوال دریافت نہیں، مختصر یہ معلوم ہے کہ وہ حضرت شیخ عبدالقدس گنگوہی (م ۹۴۵ھ) کے بلند پایہ خلفاء میں سے تھے۔ سہارنپور کی نواحی بستی "اگراہو" ان کا وطن تھا۔ وہیں ان کا مزار بھی ہے۔ (۱) حضرت شیخ عبدالقدوس کے مجموعہ مکاتیب میں مکتوب چوالیس شیخ ابوسعید کے نام ہے، جس میں حضرت شیخ عبدالقدوس نے اپنے عزیز مسترشد کو بلند کلمات سے یادفرمایا ہے۔ تحریر ہے:

"برادر دینی محبّ یقینی، برگزیدۂ حضرت اللہ، مقبول اہل اللہ، معین الضعفاء والصلحاء، خواجہ معظم ومکرم خواجہ چوہر دام عزہ"

مکتوب شیخ عبدالقدوس گنگوہی بنام شیخ ابوسعید انصاری

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے اس گرامی نامہ کا مکمل متن یہ ہے:

بجانب خواجہ چوہر......درمیان حال درویشی وتبری از ابنائے دنیا۔ حق حق حق۔ بعد ادائے مراسم اخلاص ودعاء مستجاب وثنائے مستطاب، برادر دینی، محبّ یقینی، برگزیدہ حضرت اللہ، مقبول اہل اللہ، معین الضعفاء والصلحاء، خواجہ معظم ومکرم، خواجہ چوہر دام عزہ از فقیر حقیر عبدالقدوس اسماعیل الحنفی مطالعہ نمایند۔

المقصود ھو المقصود گفتہ اند، درویش پائے شکستہ وچشم بستہ باید تا دنیا نہ بیند وبردر ابناء دنیا نرود۔ چوں سبب آخرالزماں از دون ہمتی بعارضہ تغیر احوال ونشست با آل وفرزندان ومصاحبان چیزے قبول کردہ می شود، ایں بقدر نظر بر دنیا می رود، باشد کہ پائے ہم برود، از جائے ہم رود پس از درویشی نصیبے نماند۔ فردا در زمرۂ کیان قدم نہد وو پیراں راچہ روئے نماید۔ آں عزیز، حکم نیة المومن خیر من عملہ مستحق اجر جمیل وثواب جزیل گشت۔ وآں عزیز خود ایں کار را بہتر میداند کہ نفس وشیطان چگونہ دشمناں درپے اند، ودرسینہ مومن بوساوس وہوا جس چگونہ درمی شوند، پس درویش معذول درگوشہ باید تا چیر شغل حق میسر آید، ایں ضعیف را معذور دارند، وازیں تشویش دور دارند۔

(۱) مولانا کے صاحبزادہ مولوی مظہرالحق اور سراج النسب دونوں نے اگروہہ کو سہارنپور کا قصبہ قرار دیا ہے مگر مجھے سہارنپور کے اس نام کے کسی قصبہ بلکہ بڑی بستی یا گاؤں کا نام بھی نہیں ملا۔ سہارنپور کے نئے پرانے جغرافیہ میں اس کا ذکر ہے نہ گزیٹرس میں، بظاہر اس میں کچھ غلطی ہوئی ہے معروف اگروہہ ضلع حصار پنجاب میں ہے۔

وچوں ملاقات مقسوم ازلی شدہ است بوقت خود بنفاذ رسد انشاء اللہ تعالی مزید ومعالی باد (۱)۔

اس خط کے ابتدائی کلمات اور الفاظ سے اس تعلق کا انداہ ہوتا ہے جو حضرت شیخ کو شیخ ابوسعید انصاری سے تھا۔

سلسلۂ نسب

ابوسعید کے صاحبزادہ شیخ صدرالدین، حضرت مولانا احمد علی کے جدامجد تھے۔ مولانا احمد علی سے شیخ ابوسعید تک سلسلۂ نسب اس طرح ہے:

''حضرت مولانا احمد علی محدث، بن شیخ لطف اللہ، بن شیخ محمد جمیل، بن محمد خلیل، بن شیخ احمد، بن شیخ محمد، بن شیخ صدرالدین، بن شیخ الاسلام ابوسعید جوہر انصاری'' (۲)

مولانا شیخ لطف اللہ

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ابوسعید کے بعد ان کی اولاد میں شیخ کے کمالات اور ارشاد وتربیت کا سلسلہ جاری رہا، جو حضرت مولانا احمد علی کے والد ماجد شیخ لطف اللہ کی وفات سے یہ رشتہ گویا منقطع ہوگیا تھا، بعد میں یہ علمی وراثت خدمت حدیث کی اعلیٰ شان لئے ہوئے حضرت مولانا احمد علی کے ذریعہ عام ہوئی۔

شیخ لطف اللہ نے دو نکاح کئے، دونوں سے متعدد اولادیں ہوئیں، زوجہ اول سے صرف ایک صاحبزادہ دیوان خیرات علی کا تذکرہ ملا، دوسری بیوی سے پانچ بیٹے اور ایک دختر تھیں، نام یہ ہیں: محمد علی، روشن علی، رستم علی، ظفر علی اور حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری۔

ولادت اور بچپن کے ایام

حضرت مولانا کی صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں، لیکن حضرت مولانا کے صاحبزادہ مولوی مظہر الحق کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا کی سنہ ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں ولادت ہوئی، اور ذرائع وماخذ میں بھی یہی سن درج ہے۔ گویا اس سن ولادت کی صحت پر سب کا اتفاق ہے۔

مولانا کی عمر تین سال کی ہوئی تو سہارنپور کے ایک رئیس حکیم مہدی حسن کی اہلیہ حسینی بیگم نے، مولانا کے والدین سے درخواست کی کہ اس بچہ کو ہمیں دیدیں، ہم اپنا متبنّی بنا کر رکھیں گے۔ ان لوگوں سے قدیم خاندانی مراسم تھے، اس لئے ان کے اصرار پر مولانا کو ان کی تحویل میں دیدیا گیا، اس وقت سے مولانا ان کے گھر پر اور

(۱) مکتوبات قدوسیہ۔ چہل وچہارم، ص:۶۰ (مطبع احمدی، شاہدرہ دہلی: ۱۲۸۷ھ)

(۲) سراج النسب

ان ہی کی سرپرستی میں پرورش پاتے رہے۔اس علاقہ کا ایک عام معمول ہے کہ جب بچہ چار سال چار مہینے کا ہو جاتا ہے تو اس کو پڑھنے کے لئے بٹھایا جاتا ہے۔جب مولانا اس عمر کو پہونچے تو محترمہ حسینی بیگم نے مولانا کی بسم اللہ کی رسم یا تعلیم کی ابتدا بہت دھوم دھام سے کی۔اور مولانا کو سہارنپور کے قرآن مجید کے ایک ممتاز معلم، حافظ غلام محمد صاحب کے مکتب میں قرآن پڑھنے کے لئے بٹھادیا۔

ناظرہ قرآن شریف کی تکمیل مولانا نے دو سال میں ناظرہ قرآن شریف مکمل کرلیا اور دو سپارے حفظ بھی کر لئے، حسینی بیگم صاحبہ نے اس کی بھی زوردار تقریب کی اور اس موقع پر ایک بڑی دعوت کا اہتمام کیا۔اس وقت جب مولانا مجلس میں لائے گئے، تو چند اصحاب نے کانا پھوسی کی کہ یہ تو ابھی بچہ ہے، اس نے قرآن مجید کیسے ختم کرلیا؟ میاں جی صاحب نے حسینی بیگم سے انعام لینے کے لئے یونہی کہہ دیا ہوگا۔ان لوگوں کی نگاہیں بے اعتمادی ظاہر کررہی تھیں۔اس کے بعد کیا ہوا، یہ روداد مولانا کے صاحبزادہ، مولوی مظہر الحق کے قلم سے پڑھیئے۔لکھا ہے:

> ”یہ بات میاں جی صاحب کے کان تک بھی پہونچ گئی جس سے ان کو بہت صدمہ ہوا اور انہوں نے چاہا کہ مولانا کا امتحان اس مجمع میں دلائیں، لیکن بعض اصحاب نے منع کیا کہ یہ بچے ہیں مجمع کا رعب پڑے گا، پڑھ نہ سکیں گے اور ناحق آپ کو شرمندگی ہوگی۔یہ گفتگو مولانا کے سامنے ہورہی تھی وہ خود قرآن شریف اٹھالائے اور پورا سپارہ عم حفظ پڑھ کر سنایا، پورا مجمع دنگ رہ گیا، بیگم صاحبہ اور میاں جی صاحب کو جو مسرت اور خوشی ہوئی اس کا کچھ اندازہ نہیں ہوسکتا“(۱)

فارسی کی تعلیم کا آغاز مولانا قرآن مجید کی تعلیم سے فارغ ہوئے تو فارسی پڑھانے کا اہتمام ہوا۔اس کے لئے بھی اچھے استاد کی تلاش ہوئی۔شیخ طالب علی جو اس وقت فارسی پڑھانے میں ممتاز تھے۔مولانا کی تعلیم کے لئے منتخب کئے گئے۔مولانا نے ان سے فارسی پڑھی اور ڈھائی سال میں فارسی کی درسیات تمام کرلیں۔اس زمانہ میں مولانا فارسی ایسی اچھی لکھتے تھے کہ مولانا کی انشاء کو لوگ حیرت سے دیکھتے تھے۔مولانا کی ذہانت وقابلیت کا یہ حال تھا کہ مولانا کے استاد شیخ طالب علی فرماتے تھے کہ:

(۱) تحریر مولوی مظہر الحق صاحب۔اس تحریر کی اصل حضرت مولانا احمد علی کے پوتے، جناب ظہیر النبی صاحب کے پاس محفوظ ہے۔موصوف نے راقم کو اس کے دیکھنے کا موقع دیا اور اس کی کاپی عنایت کی۔

''میں نے چالیس سال معلمی کی، اس عرصہ میں مولانا جیسا ذکی الطبع طالب علم نہیں دیکھا۔ کسی سبق کو مکرر کہلوانے کی ضرورت نہیں ہوئی''۔

حفظ قرآن شریف اور مسجد کی پہلی محراب

مولانا نے جب قرآن مجید پڑھا تو ناظرہ کے بعد دو پارے حفظ کر کے فارسی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ فارسی پڑھنے کے بعد قرآن شریف کا حفظ مکمل کرنے کا خیال ہوا اور چھے مہینہ کی کوشش سے قرآن مجید کا حفظ مکمل ہو گیا۔ اور اسی سال کم سنی میں مسجد میں قرآن شریف سنانے کی سعادت حاصل کی۔ یہ غالباً نوافل ہوتی ہوں گی یا جو بھی صورت ہو بہر حال مولانا نے ایسا رواں اور پختہ سنایا کہ مولانا کے صاحبزادہ مولوی مظہر الحق صاحب کے الفاظ میں:

''مشہور ہے کہ اول محراب میں صرف ایک لقمہ لیا تھا''

شیخ لطف اللہ اور حسینی بیگم کی وفات، تعلیم سے بے توجہی، کبوتر بازی اور شطرنج کا شوق

مولانا تعلیم کے میدان میں تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے کہ مولانا کی سرپرست اور نگراں، محترمہ حسینی بیگم صاحبہ دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ اور اسی کے قریب مولانا کے والد ماجد شیخ لطف اللہ نے بھی دنیائے فانی کو خیر باد کہہ دیا، تو مولانا بالکل بے سہارا ہو گئے اور تعلیم کا سلسلہ بھی بالکل ختم ہو گیا۔ کسی مربی اور نگراں کے نہ ہونے کی وجہ سے بری صحبتوں میں پڑ گئے، ایسے دوست احباب کا ایک حلقہ مل گیا جو اچھے اطوار کے لڑکے نہیں تھے۔ انہوں نے مولانا کو فضول مشاغل میں لگا دیا۔ مولانا رفتہ رفتہ ان چیزوں کے ایسے عادی ہو گئے کہ گویا ان میں کھو گئے۔ ہر وقت کبوتر اڑانے اور شطرنج کھیلنے کا مشغلہ تھا، مگر اس میں بھی ایسی محنت کی تھی کہ شطرنج کی دنیا میں مشہور ہو گئے تھے کہ دور دور سے شطرنج کے کھلاڑی اور شوقین مولانا کے ساتھ شطرنج کھیلنے کے لئے آنے لگے تھے۔ یہی حال کبوتروں کے شوق کا بھی تھا۔ مولانا کے پاس گرہ باز کبوتروں کے دو سو جوڑے موجود تھے، ہمہ وقت اسی خیال میں مگن اور اسی دھن میں رہتے تھے۔ خاندانی قدروں اور روایات سب کو بھول گئے تھے۔ علم اور تعلیم کی طرف کچھ توجہ نہیں تھی کہ ایک تنبیہ نے زندگی کا رخ بدل دیا۔

صبح کا بھولا شام کو گھر آتا ہے

مولانا کی سولہ سترہ سال کی عمر تھی کہ ان ہی خرافات میں رہتے تھے۔ ایک دن ہاتھ میں کبوتر پکڑے کچھ بغل میں دبائے چلے جا رہے تھے۔ راستہ میں سہارنپور کے نامور عالم اور فقیہ حضرت مولانا وجیہ الدین صدیقی محسنی اور حضرت

مولانا سعادت علی فقیہ سے ملاقات ہوئی۔ یہ دونوں حضرات مولانا کے بزرگوں اور خاندان کی دینی حیثیت سے واقف تھے۔ مولانا کے اس حال پر پہلے سے افسردہ اور فکرمند ہوں گے۔ مولانا کو آتا دیکھ کر قریب بلالیا اور تعلیم کے متعلق معلوم کیا۔ اور توجہ دلائی کہ تم ایسے خاندان کے بچے ہو، ان بے ہودہ کاموں میں پڑے ہوئے ہو، اور تعلیم سے غافل ہو۔ ان بزرگوں کا یہ کہنا اور شرم دلانا ایسا موٴثر ہوا کہ جو کام برسوں میں نہیں ہوسکا تھا وہ لمحوں میں ہوگیا۔ مولانا کی طبیعت اسی وقت ان مشغلوں سے اچاٹ ہوگئی اور اسی وقت تعلیم کی طرف توجہ کا فیصلہ کرلیا۔ گھر آئے، آتے ہی شطرنج کے تختے جلادیے، کبوتر کچھ اڑادیے کچھ تقسیم کردیے، اور ان سب کاموں سے فارغ ہوکر سہ پہر کو حضرت مولانا سعادت علی کی خدمت میں حاضر ہوگئے کہ: میں حاضر ہوں پڑھایئے۔ متعدد اصحاب نے لکھا ہے کہ اس وقت مولانا کی عمر سولہ یا سترہ سال تھی، ان اطلاعات کی روشنی میں یہ واقعہ ۴۲۔۱۲۴۱ھ (۲۷۔۱۸۲۶ء) کا ہونا چاہیے۔

حضرت مولانا وجیہ الدین سہارنپوری سے تلمذ اور مختلف علوم میں استفادہ

مولانا سعادت علی کی خدمت سے اخذ واستفادہ کے بعد اعلیٰ درجات کی کتابوں اور حدیث شریف کے درس کے لئے حضرت مولانا وجیہ الدین صدیقی سہارنپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے، جو کتابیں حضرت مولانا سعادت علی سے پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا، مولانا کی خدمت میں ان کی تکمیل کی۔ فقہ معانی وبیان اور صحاح ستہ میں حضرت مولانا وجیہ الدین سے فیضیاب ہوئے۔ حضرت مولانا کا معاملہ بھی نہایت شفقت ومہربانی کا تھا۔ اکثر فجر کے بعد سے ظہر تک مسلسل سبق ہوتا۔ حضرت مولانا بھی مولانا احمد علی کی ذہانت وذکاوت اور حافظہ کے معترف تھے۔ فرمایا کرتے تھے:

”میں نے ذکی اور ذہین طلبا دیکھے مگر مولانا جیسا ذہین اور سلیم وفہیم نظر سے نہیں گزرا“

بخاری شریف کا پہلا دور مکمل ہوکر حضرت مولانا وجیہ الدین سے اجازت وسند صحیح بخاری

حضرت مولانا وجیہ الدین نے اکثر درسیات حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی سے پڑھی تھیں۔ خیال ہے کہ مولانا عبدالحیٔ بڈھانوی کے علاوہ حضرت شاہ عبدالعزیز اور ان کے برادران والا مقام، حضرت شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر رحمہم اللہ سے بھی استفادہ کیا ہوگا۔

مولانا احمد علی کی بخاری شریف کی پہلی سند واجازت حضرت مولانا وجیہ الدین کے واسطہ سے ہے۔ مولانا وجیہ الدین کو مولانا عبدالحئ بڈھانوی سے تلمذ اور اجازت ہے جو حضرت شاہ عبدالعزیز کے بالکل ابتدائی زمانہ کے اہم ترین شاگردوں میں تھے۔ حضرت مولانا احمد علی نے بخاری شریف کے مقدمہ میں اپنی سند حدیث ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"قرأت اکثر ھذہ الجامع الصحیح للبخاری رحمہ اللہ تعالیٰ علی الفاضل الفقیہ الالمعی، الشیخ وجیہ الدین المحسنی الصدیقی السھارنپوری، فی البلدۃ السھار نفور صانھا اللہ عن الآفات والشرور. وحصل لہ الاجازۃ و القرأۃ عن الشیخ ، العالم الربانی مو لا نا عبد الحئی، عن الشیخ الماھر فی علم الباطن والظاھر ، مو لا نا عبد القادر، عن اخیہ الشیخ عبدالعزیز ، عن ابیہ الشیخ ولی اللہ "(۱)

حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی سے تلمذ

مولانا احمد علی اپنے اسی زمانہ تعلیم میں حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے ہیں اوران سے بھی پڑھا ہے۔ اگرچہ یہ معلوم نہیں کہ مولانا مفتی صاحب کی خدمت میں کب حاضر ہوئے ہیں اوران سے کیا کیا پڑھا، لیکن اطلاعات وقرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے حضرت مفتی صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا ہے۔ مفتی الٰہی بخش کے پرپوتے اوران کے ایک تذکرہ نگار، مولانا ریاض الحسن محمد سلیمان کاندھلوی (وفات ۱۳۱۵ھ) نے مفتی صاحب کے شاگردوں کی فہرست میں مولانا کا نام بھی درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

تیسرے [شاگرد] مولوی احمد علی سہارنپوری ہیں جن کے حالات سے عامہ خلائق واقف ہیں اور اکثر سلسلے حدیث کے اس وقت انہی حضرت کے ذریعہ سے جاری ہیں۔ ان حضرت نے اخیر عمر میں مفتی صاحب سے تحصیل شروع کی اور حیات حضرت مفتی صاحب مرحوم میں الفراغ تحصیل علوم سے پوری طرح سے حاصل نہیں ہوا تھا، اتمام علوم کا حضرت مولانا اسحاق صاحب سے فرمایا ہے (۲)

(۱) مقدمہ صحیح بخاری حضرت مولانا احمد علی محدث ص:۱۲ (عکس نور محمد دہلی: بلاسنہ)

(۲) تذکرہ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی۔ مؤلفہ ومکتوبہ مولانا ریاض الحسن محمد سلیمان کاندھلوی، ورق [مملوکہ راقم سطور]

مولانا احمد حسن کانپوری نائب صدر مدرس مظاہر علوم کی مفتی صاحب سے تلمذ کی ضمنی توثیق

یہاں یہ وضاحت مفید بلکہ ضروری ہے کہ اختتام مثنوی مولانا روم، تالیف حضرت مفتی الٰہی بخش کا جو نسخہ حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکی کی ہدایت کے مطابق کانپور سے مطبع نامی سے مطبوعہ مثنوی مولانا روم کے تکملہ کے طور پر چھپا تھا، اس کے آخر میں مفتی صاحب کے احوال پر ایک ضمیمہ شامل ہے جو فارسی میں ہے۔ یہ احوال یا ضمیمہ مولانا محمد سلیمان کاندھلوی کے اسی مذکورہ بالا تذکرہ کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ نامور عالم اور مظاہر علوم سہارنپور کے سب سے پہلے نائب صدر مدرس مولانا احمد حسن پنجابی ثم کانپوری نے کیا تھا اور خود ہی چھپوایا تھا۔ اس لئے قرین قیاس ہے کہ یہ حالات مولانا احمد حسن کی فرمائش پر قلم بند کئے گئے ہوں گے۔ یہاں مولانا احمد حسن کا کیا ہوا اس عبارت کا ترجمہ بھی ملاحظہ ہو:

> ''سوم جناب مولوی احمد علی سہارنپوری بودند۔ رحمہ اللہ تعالیٰ! دریں ایام سلسلۂ حدیث شریف بذریعہ اوشاں بسیار جاریست، چوں کہ در آخر عمر حضرت ایشاں بزمرہ مستفیداں در آمدند، ازیں جہت تکمیل علوم اوشاں بخدمت حضرت مفتی صاحب صورت نہ بست بخدمت جناب مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی تحصیل علوم را باتمام رسانید۔ رحمہم اللہ تعالیٰ'' (۱)

اس روایت کی توثیق کی اور بھی وجوہ ہیں مگر بعض اصحاب کو اس اطلاع کے تسلیم کرنے میں تامل ہے اور انہوں نے اس کی گویا باقاعدہ تردید کی (بلا کسی دلیل وقرینہ کے) کوشش فرمائی ہے (۲) اس لئے چند معروضات پیش ہیں:

مفتی صاحب سے تلمذ کی وجوہ

(۱) تذکرہ مفتی الٰہی بخش کے مرتب مولانا محمد سلیمان (وفات ۱۳۱۵ھ) حضرت مولانا احمد علی سے اچھی طرح واقف اور ان کو دیکھنے جاننے والوں میں سے تھے، مولانا سلیمان کی اپنے بڑوں اور خاندان کے اکابر کی اطلاعات وروایات پر توجہ تھی۔ اس لئے قرین قیاس ہے کہ انہوں نے یہ بات خود حضرت مولانا احمد علی یا اپنے والد ماجد وغیرہ سے سنی ہوگی۔

---

(۱) تذکرہ حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی۔ (مشمولہ تکملہ یا اختتام مثنوی مولانا روم) ص: ۸۶ (محمود المطابع، کان پور)

(۲) ملاحظہ ہو: قصیدہ نفح المشموم فی مدح مظاہر علوم، تالیف وحواشی، مولانا اطہر حسین صاحب ص: ۲۵ (سہارن پور ۱۴۲۳ھ/۲۰۰۳ء)

(۲) حضرت مفتی صاحب کی سنہ ۱۲۴۵ھ (۱۸۲۹ء) میں وفات ہوئی، اس وقت حضرت مولانا احمد علی کی عمر تقریباً بیس سال تھی، اور اس وقت مولانا کا تعلیم کا دوسرا دور چل رہا تھا جس میں مولانا، حضرت مولانا سعادت علی اور مولانا وجیہ الدین سے پڑھ رہے تھے، اگر اسی دوران کچھ مہینے مفتی صاحب کی خدمت میں گذار لئے ہوں، تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔

(۳) مولانا کے خاص استاد حضرت مولانا وجیہ الدین سہارنپوری، مفتی صاحب کے زمانہ ملازمت و قیام سہارنپور کے اہم شاگرد ہیں۔ کیا مولانا وجیہ الدین صاحب نے اپنے ہونہار شاگرد کو اپنے استاد محترم کی خدمت میں حاضر ہونے کی ترغیب نہ دی ہوگی؟ بلکہ عجب نہیں کہ خود لیکر گئے ہوں اور پڑھا دینے کی درخواست کی ہو۔

(۴) اس تذکرہ اور فارسی میں اس روایت کے ناقل و مترجم مولانا احمد حسن نے تقریباً گیارہ سال مظاہر علوم میں اور سات سال حضرت مولانا احمد علی کی رفاقت و سرپرستی میں گزارے۔ کیا مولانا کی موجودگی میں حضرت مولانا احمد علی کے استادوں اور مرحلہ تعلیم و تربیت کا ذکر نہ آیا ہوگا؟ اور کیا مولانا احمد حسن نے اس اطلاع کو غلط سمجھ کر بھی فارسی میں ترجمہ کر دیا ہوگا؟

(۵) اگر یہ روایت غلط ہوتی تو مولانا احمد حسن کی محتاط طبیعت کا تقاضہ تھا کہ وہ اس کی برملا تردید فرماتے یا اس کو درج ہی نہ کرتے۔ دونوں باتوں کا نہ ہونا اس اطلاع کی تائید و توثیق ہی ہے۔

(۶) اس روایت کی تردید میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ مولانا کے حضرت مفتی صاحب سے تلمذ کا کسی اور نے ذکر نہیں کیا۔ اس لئے روایت لائق توجہ اور قابل قبول نہیں ہے۔ مگر کیا ہر وہ روایت جو اس سے پہلے کسی اور تحریر میں نہ آئی قابل تردید ہوتی ہے؟ اگر یہی معیار ہے تو حضرت مولانا احمد علی صاحب کے لئے بالخصوص، نیز اور بھی متعدد علمائے کرام کے حوالہ سے جو اطلاعات و روایات قدیم مطبوعہ مآخذ و منابع میں موجود نہیں، بعد میں دریافت و دستیاب ہوئیں، سب کی تردید کی جائے گی۔ اگر یہ اصول صحیح ہے تو وہ اطلاعات جو خود حضرت مولانا احمد علی کی تحریرات اور بیاض میں درج ہیں اور مولانا کے فرزند، مولوی مظہر الحق صاحب کی مکتوبہ مگر نو دریافت تحریر میں شامل ہیں، ان کی بھی تردید کی جانی چاہئے، کیوں کہ وہ معلوم اطلاعات پر اضافہ بھی ہیں اور بعض قدیم مندرجات کی تصدیق و تردید بھی۔

(۷) قدیم روایات واطلاعات کو بہر صورت حرف آخر سمجھ لینا اور ان میں کسی بھی اضافہ یا ان کی چھان پھٹک نہ کرنا، دیانت وانصاف کا خون کرنا ہے۔ علم و تحقیق کی دنیا میں نئی اطلاعات و شواہد برابر دریافت

ہوتے اور سامنے آتے رہتے ہیں، جس سے قدیم روایات کی تحقیق وتصدیق بھی ہوتی ہے اور ان کی فردگزاشتوں کی تصحیح وتحقیق کا موقع بھی ملتا ہے اوران پر اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ اگر ہم یہ طے کر لیتے ہیں کہ ہر پرانی اطلاع قولِ فیصل اور ہر نئی دریافت اور روایات وماٰخذ نا قابل التفات ہیں، تو علمی ترقیات کا دروازہ آج ہی بند ہو جائے گا۔

(۸) دراصل ہمارے یہاں اکثر معلومات وسوانحات میں تحقیق کی اور شخصیات اور واقعات کے تمام پہلوؤں کو جاننے سمجھنے اور جانچنے کی بہت کم کوشش ہوئی ہے۔ جس موضوع پر جس کسی نے سب سے پہلے اور جو کچھ لکھ دیا وہی حرف آخر بن گیا۔ حالاں کہ وہ بے چارہ مرتب ومؤلف نہ اس کا دعویدار تھا اور نہ ہوسکتا تھا کہ فلاں موضوع پر جو کچھ لکھا ہے، اس کا حرف حرف اور ایک ایک اطلاع مصدقہ اور ایسی معتبر ہے کہ اس میں حذف کی گنجائش نہ اب ہے نہ آئندہ ہوسکتی ہے۔ اس کی کسی ذی ہوش اور عالم فاضل سے امید بھی نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس طرح کا فضول اور بے تکا دعویٰ کرے گا۔ اور یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی بھی بڑے سے بڑے فاضل، علامہ اور محقق کی کتاب یا تحقیق اس موضوع کے تمام گوشوں اور جملہ ماٰخذ و منابع پر حاوی اور موجود ومتوقع تمام سوالات وتحقیقات کی جامع ہو۔ ہمیشہ ہر موضوع کی معتبر سے معتبر اطلاعات پر اور اکثر علوم وفنون خصوصاً تاریخ وتذکرہ نویسی میں اضافات وتحقیقات پر سوالیہ نشان کی گنجائش ہمہ وقت رہتی ہے اور آئندہ بھی رہے گی، اور یہ کسی مصنف کی توہین وتنقیص نہیں بلکہ یہ انہی کے لگائے ہوئے شجر علم کے برگ وبار ہیں جو بعد میں نمودار ہوتے ہیں اور مرکز توجہ بنتے ہیں۔ اس لئے اس طرح کی معلومات کے لئے تمتع زہر گوشہ یا فتم کو اصول اور کم ترک الاول للاخر کو نقطہ بنا کر فیصلہ کرنا چاہئے۔ واللہ الموفق وھو یھدی السبیل.

(۹) نیز **نفخ الشموم** کے حاشیہ میں کہا گیا ہے کہ:

"و ذکر بعضھم تلمذہ فی الحدیث علی مو لانا مفتی الٰھی بخش الکاندھلوی لکنہ مستبعد عادۃ"

یہ بات اور وجوہات کے علاوہ اس لئے بھی درست نہیں کہ حضرت مولانا احمد علی کے حضرت مفتی صاحب سے صرف تلمذ کا ذکر آیا ہے۔ جو بہ ظاہر صحیح ہے، تمام شواہد وقرائن اس کے مؤید ہیں، اس لئے تلمذ حدیث کی بات کی تردید غیر ضروری اور بے محل ہے۔

(۱۰) جہاں تک مولانا کی تعلیم کی عمر کا سوال ہے تو اس میں مولوی مظہرالحق کی اطلاع متأخر روایات کی نسبت زیادہ معتبر و مُوثق ہے۔

نوجوانی میں تعلیم کے لئے دہلی کا پہلا سفر

حضرت مولانا کی حضرت مفتی الٰہی بخش کی خدمت میں کس قدر عرصہ حاضری رہی اور کیا پڑھا اس کا تذکرہ مجھے نہیں ملا، لیکن مفتی صاحب کے بعد جلد ہی مزید تعلیم کے لئے دہلی چلے گئے تھے۔ افسوس ہے کہ اس سفر کی تفصیلات اس زمانہ کی پڑھی ہوئی کتابوں اور استادوں کا تذکرہ دستیاب نہیں۔ حضرت مولانا کے دہلی کے اس سفر کا، مولانا کی مولانا نذیر حسین محدث سے گفتگو کی ایک یادداشت سے علم ہوتا ہے۔ حضرت مولانا احمد علی، مولانا نذیر حسین سے ملاقات کے لئے گئے تھے، اس وقت مولانا نذیر حسین کے حضرت شاہ محمد اسحاق سے تلمذ کا تذکرہ آیا، اس گفتگو میں (جیسا کہ مؤلف الحیات بعد الممات نے نقل کیا ہے) حضرت مولانا احمد علی نے فرمایا:

> ''میں جب پہلی مرتبہ اپنے والد کے ساتھ دہلی آیا تھا اس وقت آپ (مولانا نذیر حسین) نے شرح ملا شروع کی تھی، جس کی مٹھائی میں نے بھی کھائی تھی۔ میاں صاحب (مولانا نذیر حسین) نے پوچھا، پھر تم کتنے دنوں بعد دلی آئے؟ مولوی [احمد علی صاحب] نے کہا بارہ برس بعد'' (۱)

اس روایت کے اور مندرجات و متعلقات پر گفتگو ہمارے موضوع سے خارج ہے، تاہم اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ مولانا نذیر حسین کے زمانہ طالب علمی میں، حضرت مولانا احمد علی بھی اپنے والد صاحب کے ساتھ تعلیم کے لئے دہلی گئے تھے۔

راقم سطور کا خیال یہ ہے کہ یہ سفر سنہ ۱۲۴۵ھ کے آخر یا ۱۲۴۶ھ میں ہوا ہوگا۔ اس کا قرینہ یہ ہے کہ مولانا سید نذیر حسین صاحب سنہ ۱۲۴۳ھ (غالباً شعبان) میں دہلی پہنچے تھے اور اس وقت تک انہوں نے صرف ہدایہ النحو پڑھی تھی، اس کے بعد صرف ونحو کی اور کتابیں متعلقہ درسیات کے ساتھ پڑھیں، ظاہر ہے کہ اس میں کم سے کم دو سال اور لگے ہوں گے۔ اس کے بعد ہی شرح ملا جامی کی تعلیم کا موقع ملا ہوگا (۲) اس لئے یہ واقعہ تقریباً ۴۵۔۱۲۴۶ھ کا ہے۔

---

(۱) الحیات بعد الممات۔ مولانا فضل حسین نزہتی ص: ۴۸ (طبع اول، آگرہ: ۱۳۴۶ھ)

(۲) ملاحظہ ہو: الحیات بعد الممات ص: ۳۰ تا ۳۶

ملازمت کے لئے فرخ آباد کا سفر اور مولانا خدا بخش سے عربی ادب کی تعلیم

مولانا نے تعلیم پر سولہ سترہ سال کی عمر میں (تقریباً ۴۲-۱۲۴۱ھ) میں توجہ فرمائی تھی، مولانا جس بلا کے ذہین تھے اور جیسا غیر معمولی حافظہ پایا تھا کہ استاد کو سبق دہرانے کی ضرورت نہیں تھی، اس سے خیال کیا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا نے درسیات کی تمام بنیادی کتابیں بیس اکیس سال تک کی عمر میں پڑھ لی ہوں گی۔ اسی زمانہ میں مولانا کا نکاح ہو گیا تھا۔ اس لئے تلاش معاش کے لئے سہارنپور سے رخصت ہو کر فرخ آباد پہنچے جو پٹھانوں کی ایک باوقار ریاست تھی۔ فرخ آباد میں مولانا کے خاندان کے ایک شخص تحصیلدار تھے۔ ان کی وساطت سے یہ سفر ہوا تھا۔ فرخ آباد میں ایک عالم اور مدرس مولانا خدا بخش تھے، جو عربی ادب میں مہارت کے لئے مشہور تھے۔ فرخ آباد پہنچ کر خیال یہ ہوا کہ مولانا خدا بخش سے عربی ادب پڑھ لیا جائے۔ اس لئے ملازمت کا ارادہ ترک کر کے مولانا خدا بخش کے حلقۂ درس میں حاضر ہو گئے۔

فرخ آباد کب جانا ہوا تھا وہاں کس قدر قیام فرمایا؟ مولانا خدا بخش صاحب سے کیا کیا کتابیں پڑھیں؟ مولانا خدا بخش کون تھے؟ کہاں کے رہنے والے تھے، فرخ آباد میں کس حیثیت سے قیام تھا؟ اور کیا حضرت مولانا احمد علی کا فرخ آباد میں معاش کا بھی کوئی سلسلہ تھا؟ اور اس سے کس قدر آمدنی ہوتی تھی؟ کچھ معلوم نہیں۔ تاہم حضرت مولانا کے فرزند، مولوی مظہر الحق کی تحریر سے یہ خیال ہوتا ہے کہ مولانا نے فرخ آباد میں غالباً کئی سال اور اگر راقم کا اندازہ صحیح ہو تو تقریباً دس سال بسر کئے۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو اس کے ماننے میں بھی تامل نہ ہونا چاہیے کہ فرخ آباد میں حضرت مولانا نے کوئی کاروبار یا مناسب ذریعہ معاش بھی جاری رکھا ہوگا۔

مولانا مملوک العلی سے استفادہ کے لئے دہلی کا سفر

فرخ آباد سے غالباً ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۱ء) میں دہلی کا سفر ہوا، اگرچہ مولانا کے فرزند مولوی مظہر الحق نے اس سفر کا سنہ ۱۲۵۸ھ لکھا ہے، مگر وہ صحیح معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ مولانا نے دہلی قیام کے وقت حضرت مولانا مملوک العلی سے کثیر استفادہ کیا، مولانا نانوتوی کے متعدد شاگردوں کو مختلف کتابوں کے سبق دئے، آخر میں حضرت شاہ محمد اسحاق کی صحبت سے بھی فائدہ اٹھایا اور شاہ صاحب ذی قعدہ ۱۲۵۸ھ میں دہلی سے سفر ہجرت کے لئے روانہ ہو گئے تھے۔ اس لئے قرین قیاس ہے کہ مولانا احمد علی تقریباً ۱۲۵۷ھ میں دہلی

پہونچے ہوں گے، جب یہ صراحت موجود ہے کہ مولانا اول حضرت مولانا مملوک العلی کی خدمت میں حاضر رہے، بعد میں حضرت شاہ اسحاق سے تلمذ ہوا، اوران روایات سے یہ بھی جھلکتا ہے کہ حضرت مولانا مملوک العلی کی خدمت میں خاصا قیام رہا۔

حضرت مولانا احمد علی کی حضرت مولانا مملوک العلی کی خدمت میں تعلیم وتلمذ کے لئے حاضری مولانا سے خاصے استفادہ اوراس مقصد کے لئے حضرت مولانا سے طویل رابطہ کی اور ذرائع کے علاوہ، خود حضرت مولانا احمد علی کی تحریرات سے بھی تصدیق ہوتی ہے، اور مولانا کے فرزند مولوی مظہر الحق صاحب نے بھی اپنی تحریر میں اس کا ذکر کیا ہے، مگر حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری کی مدت کیا تھی اور حضرت مولانا سے کن علوم کی کن کتابوں میں تلمذ کی سعادت ملی، اس کی کوئی اطلاع ہمدست نہیں مگر قرین قیاس ہے کہ حضرت مولانا احمد علی جواس سے پہلے حضرت مولانا وجیہ الدین سہارنپوری کے علاوہ فرخ آباد وغیرہ کے علماء سے اعلی درجہ میں کسب کمال کر چکے تھے۔ انہوں نے حضرت مولانا مملوک العلی سے منتخب اعلی منتہیانہ کتابیں پڑھی ہوں گی۔

حضرت شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں حاضری

جس وقت حضرت مولانا، مولانا وجیہ الدین صاحب سے پڑھ رہے تھے۔ اس زمانہ میں برصغیر کے علمی افق پر حضرت شاہ محمد اسحاق کی علمی فرماں روائی کا پرچم لہرا رہا تھا اور ہر ایک اس کو کمال کی سند اور اپنے اعتبار وعزت کا نشان جانتا تھا۔ مولانا وجیہ الدین تو خود اسی خاندان کے فیض یافتہ تھے، اس لئے ابتدا سے ہی حضرت مولانا احمد علی بھی اس خاندان سے وابستگی کی تمنا اور حضرت محمد اسحاق سے استفادہ کا خیال رکھتے ہوں گے، لیکن اس کا موقع بہت دیر سے ملا۔

جب مولانا فرخ آباد میں تھے اس وقت دہلی حاضری کا ارادہ ہوا اور حضرت مولانا مملوک العلی سے تلمذ کے علاوہ حضرت شاہ محمد اسحاق سے حدیث شریف پڑھنے کا بھی ارادہ کرلیا۔ مولانا کو حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ شاہ صاحب کے ہندوستان سے رخصت ہونے اور سفر ہجرت کا مقررہ وقت آ گیا، حضرت شاہ صاحب ذی قعدہ سنہ (۱۲۵۸ھ) میں دہلی سے ہجرت کے ارادہ سے رخصت ہو گئے۔

سفرِ ہجرت کے وقت حضرت شاہ محمد اسحاق کا پڑھانے کا ارادہ اور وعدہ

مولانا نے رخصت کے وقت حضرت شاہ صاحب سے عرض کیا کہ اگر یہ خادم مکہ معظمہ حاضر ہو جائے تو کیا آپ پڑھائیں گے؟ شاہ صاحب نے فرمایا:

''آپ آئیں گے اور ان شاء اللہ میں حدیث پڑھاؤں گا''(۱)

حضرت شاہ صاحب کے سفرِ ہجرت کے وقت متعدد علماء اور متوسلین کا ایک بڑا قافلہ حضرت شاہ صاحب کے ساتھ تھا، جس میں مولانا سعادت علی فقیہ سہارنپوری بھی شامل تھے۔ حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی بھی جو اس خاندان کے دست گرفتہ تھے، چاہتے رہے کہ ان کو بھی شاہ صاحب کی رفاقت کا موقع ملے مگر دہلی کالج سے (جہاں وہ نائب صدر مدرس اور بڑے ذمہ دار تھے) رخصت نہ ملنے کی وجہ سے اس قافلہ کا ساتھ دینے سے قاصر رہے، مگر فوراً حاضری کا ارادہ تھا، اس کے لئے رخصت کی درخواست دیدی تھی۔ خیال یہ تھا کہ جیسے ہی رخصت منظور ہوگی اسی دم چل دیں گے۔ اسی خیال سے سفر کی تیاری کرتے رہے، تیاری مکمل تھی کہ بہ ظاہر رجب ۱۲۵۹ھ (آخر اگست ۱۸۴۳ء) میں رخصت کی منظوری کی خبر ملی۔ تیاری مکمل تھی لہٰذا اسی مہینہ میں روانگی طے کرلی گئی۔

حضرت شاہ محمد اسحاق کی خدمت میں پڑھنے کے لئے مکہ معظّمہ کے سفر کا ارادہ

حضرت مولانا مملوک العلی کے سفرِ حج وزیارت کے ارادہ سے حضرت مولانا نے بھی مولانا مملوک العلی کی سرپرستی میں مکہ معظّمہ حاضر ہو کر، حضرت شاہ صاحب سے جو کتابیں پڑھنی شروع کی تھیں مکہ معظمہ حاضر ہو کر اور شاہ صاحب کی خدمت میں اطمینان سے رہ کر دوبارہ مکمل طریقے سے پڑھنے کا فیصلہ کرلیا، مگر (مولانا کے فرزند، مولوی مظہر الحق کی اطلاع کے مطابق) ایسے مالی وسائل موجود نہیں تھے کہ مولانا اس سفر اور اپنے اہل وعیال کی جملہ ضروریات کے خرچ کا ایک ساتھ تحمل کر سکتے۔ اس کشمکش میں سہارنپور آئے اپنے بھائی مولوی روشن علی سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے مولانا کی حوصلہ افزائی کی اہل وعیال کے مصارف کی طرف سے اطمینان دلایا اور کہا کہ:

''آپ مایوس نہ ہوں اگر آپ حرمین جانا چاہتے ہیں تو واپسی تک آپ کے اہل وعیال

(۱) تحریر مولوی مظہر الحق (فرزند حضرت مولانا)

کے مصارف کا میں کفیل ہوں‘‘(۱)

مولوی روشن علی کی بات سے گھر کی ضروریات اور خرچ کی طرف سے اطمینان ہوگیا تھا، لیکن راستہ کے کثیر اخراجات اور مکہ مکرمہ میں قیام کے زمانہ کی ضروریات کے لئے بھی رقم کی فراہمی کا ایک بڑا مسئلہ تھا، لیکن مولانا سفر کا پختہ ارادہ کئے ہوئے تھے اور زادراہ کا انتظام ہوئے بغیر، توکل بہ خدا سفر کے لئے سوچ رہے تھے۔

مصارف سفر کا انتظام

مولانا کے صاحبزادے مولوی مظہر الحق صاحب کی اطلاع ہے کہ سفر کا وقت بالکل قریب آگیا تھا مگر مولانا خالی ہاتھ تھے، ایک پیسہ بھی پاس نہیں تھا مگر مولانا اپنے ارادہ پر قائم تھے اور طے کر رکھا تھا کہ انشاء اللہ اس قافلہ کے ساتھ چلوں گا۔ عین سفر کے وقت منجانب اللہ مدد آئی جو تمام مصارف سفر کو کافی تھی۔

اس کی صورت یہ ہوئی کہ ایک نوجوان جو اس قافلہ کے ساتھ، تعلیم کے ارادہ سے مکہ مکرمہ جارہے تھے ان کے والد کو ڈر تھا کہ اس سفر میں، جو اس زمانہ میں تقریباً چھ مہینے کی مسافت تھی، اگر یہ لڑکا اپنی تعلیم اور درسی کتابوں سے غافل رہا تو اس کی تعلیم اور لیاقت کو نقصان پہنچے گا، اس کی موجودہ استعداد بھی ضائع ہوجائے گی، اور آئندہ کے تعلیمی سفر میں بھی خلل پڑے گا۔ اس لئے ان کو کسی ایسے عالم کی تلاش تھی جو اس سفر میں شریک ہوں اور سفر میں اس لڑکے کی تعلیمی نگرانی فرماتے رہیں اور اس کو ضروری کتابیں بھی پڑھاتے رہیں، اس کے لئے ان کی نگہ انتخاب حضرت مولانا احمد علی پر گئی، وہ حضرت مولانا کی خدمت میں آئے اور کہا کہ اس لڑکے کو سفر میں سبق پڑھادیا کریں تو مجھ پر احسان ہوگا، حضرت مولانا نے اس کو منظور کرلیا اور فرمایا:

’’اگر وہ کتاب لے کر میرے پاس آیا کریں گے تو میں انکار نہ کروں گا‘‘۔(۱)

بات طے ہوگئی اور وہ چلے گئے، دوسرے دن اس قافلہ کی روانگی متوقع تھی جس میں حضرت مولانا اور یہ طالب علم بھی آمادہ سفر تھے، صبح کے وقت وہ شخص دوبارہ آئے، اپنے بیٹے کو مولانا کے سپرد کیا اور دو سو روپے نذرانہ اور مصارف سفر کے طور پر مولانا کی خدمت میں پیش کئے، مولانا نے اوّل انکار کیا جب ان کا اصرار بڑھا تو قبول فرمالئے۔ یہ مولوی مظہر الحق صاحب کی اطلاع ہے۔

(۱......۲) تحریر مولوی مظہر الحق فرزند حضرت مولانا

ممکن ہے یہ روایت صحیح ہو اوران صاحب نے بھی مولانا کو رقم پیش کی ہو، مگر حضرت مولانا کی ذاتی بیاض سے جو اس سفر میں ساتھ تھی، معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا ماشاء اللہ مصارف سفر کے متحمل تھے، اور سفر سے پہلے اپنے حسابات کر کے اور قرض وغیرہ بھی ادا کر کے گئے تھے۔

نیز مولانا احمد علی نے اپنی بیاض میں شاہ محمد اسحاق کا ایک خط نقل کیا ہے اس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا کا ہندوستان سے روانگی سے پہلے بھی ہندوستان میں کتابوں کی تجارت کا اچھا کاروبار تھا۔ حضرت مولانا رجب ۱۲۵۹ھ کی آخری تاریخوں میں دہلی سے روانہ ہوئے تھے، اس زمانہ میں دہلی وغیرہ سے جدہ تک کا سفر کئی قسطوں میں اور عموماً تقریباً چھ مہینہ میں طے ہوتا تھا، مگر یہ سفر خلاف معمول بہت جلد طے ہوا۔

سفر حج کے لئے روانگی کی تاریخ اور سنہ

حضرت مولانا مملوک العلی اور حضرت مولانا احمد علی اس سفر کے لئے دہلی سے کب روانہ ہو گئے۔ تذکروں اور مآخذ میں اس کی صراحت نہیں۔ صرف (حضرت مولانا مملوک العلی کے فرزند ارجمند) مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ یہ سفر ۱۲۵۸ھ میں ہوا تھا، مگر مولانا محمد یعقوب کی تحریر میں ۱۲۵۸ھ کا سنہ درست نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ سفر سنہ ۱۲۵۹ھ میں ہوا تھا، ذی قعدہ ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں حضرت شاہ محمد اسحاق نے دہلی کو الوداع کہا، اس کے تقریباً نو مہینے کے بعد یہ قافلہ جس میں حضرت مولانا احمد علی اور حضرت مولانا مملوک العلی وغیرہ شامل تھے۔ ۲۶/رجب ۱۲۵۹ھ (۲۳/ستمبر ۱۸۴۳ء) کو دہلی سے روانہ ہوا تھا، اس اطلاع کی ناقابل تردید شہادت خود حضرت مولانا احمد علی کی تحریرات ہیں۔ حضرت مولانا نے اپنی بیاض میں یادداشت رقم فرمائی ہے:

> ''خرچ سفر حج، واقع بتاریخ بست وششم رجب ۱۲۵۹ھ روز پنجشنبہ از مقام دہلی''

اسی بیاض کے ایک اور اندراج میں یہ صراحت بھی ہے کہ مولانا احمد علی، حضرت مولانا مملوک العلی کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔

> ''فہرست کتب کہ بوقت رفتن سمت مغرب، بمعیت مولوی مملوک العلی، بتاریخ بست وششم رجب یوم پنجشنبہ۔ سنہ ۱۲۵۹ھ درآن احمد علی بودند'' (۱)

ترجمہ: ان کتابوں کی فہرست جو مغربی کی طرف اس سفر میں جو مولانا مملوک العلی کی ہمراہی میں ۲۶/رجب ۱۲۵۹ھ جمعرات کے دن (شروع) ہوا تھا، احمد علی کے سامان میں ہیں''۔

---

(۱) حضرت مولانا کی یہ نہایت اہم بیاض ہمارے ذخیرہ میں محفوظ ہے۔ فالحمدلله علی ذٰلک!

مگر افسوس ہے کہ حضرت مولانا کی اس بیاض میں مکہ معظمہ پہنچنے کی تاریخ درج نہیں اور اس سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ حضرت مولانا احمد علی کا مکہ معظمہ میں کب تک قیام رہا۔

دہلی اور مکہ معظّمہ میں قاری عبدالرحمٰن پانی پتی اور حضرت مولانا ہم سبق تھے

جب حضرت شاہ صاحب دہلی سے روانہ ہوئے اس وقت حضرت صاحب کے متعدد شاگرد جس میں مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی بھی شامل تھے، شاہ صاحب کے ہمرکاب تھے۔ قاری صاحب دہلی میں حضرت مولانا احمد علی کے ہم سبق تھے۔ جب مولانا احمد علی مکہ معظّمہ پہنچے اس وقت بھی مولانا عبدالرحمٰن اور حضرت مولانا احمد علی اسباق میں رفیق رہے۔ دونوں صاحبان نے تقریباً ایک سال تک حضرت شاہ صاحب سے پڑھا اور اجازت وسند حاصل کی۔

قاری عبدالرحمٰن کے سوانح نگار مولانا عبدالحلیم انصاری نے صراحت کی ہے کہ:

> ''جو درس صاحب سوانح (قاری عبدالرحمٰن) نے مکہ معظّمہ میں ایک سال تک حضرت شاہ صاحب سے لیا، اس میں جناب مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری بھی آپ کے ساتھ شامل تھے'' (۱)

حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری، حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں تعلیم کے ارادہ سے ارکان حج کی تکمیل اور مدینہ طیبہ کی زیارت وحاضری کے بعد ہی پہنچے ہوں گے اور اس وقت سے کم سے کم ایک سال تک، جیسا کہ مولانا عبدالحلیم انصاری کی تحریر سے جھلکتا ہے، حضرت شاہ صاحب کے درس سے فیضیاب ہوئے اور تعلیم کتب حدیث میں مشغول رہے۔ حضرت مولانا نے شاہ صاحب کی خدمت میں کیا کیا پڑھا، اس کا حضرت مولانا کی کسی تحریر میں تذکرہ مجھے نہیں ملا، لیکن حضرت شاہ صاحب نے حضرت مولانا کو جو سند عطا فرمائی تھی اس میں اس کا خاصا احوال مرقوم ہے کہ حضرت مولانا نے حضرت شاہ صاحب کے حضور کن کتابوں کی قرأت وسماعت فرمائی اور کن جواہرات سے اپنا دامن مراد پُر کیا، اور اس بحر علم میں غواصی فرما کر کیسے کیسے درنایاب اور لاثانی خزانے حاصل کئے۔

مکہ معظّمہ میں قیام کی مدت

حضرت مولانا نے مکہ معظّمہ میں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں کس قدر وقت گزارا، راقم سطور کو اس کی صراحت نہیں ملی، مگر

(۱) تذکرہ رحمانیہ ص: ۴۵ (عکس طبع اوّل۔ لاہور: ۱۴۰۰ھ......۱۹۸۰ء)

بعض قرائن اور ضمنی مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم سے کم ڈیڑھ سال یا دو سال مکہ معظمہ میں حاضر رہے ہیں، اور جیسا کہ اس زمانہ کے اساتذہ کرام اور طلباء کا ذوق ومزاج تھا کہ وہ اپنے اوقات کا ایک ایک لمحہ درس وتعلیم کی نذر فرمادیتے تھے اور کوئی وقت بھی فارغ نہ گزارتے تھے، یقیناً حضرت مولانا نے بھی حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں ایسا ہی وقت گزارا ہوگا اور حضرت شاہ صاحب نے ان پر ویسی ہی شفقت وتوجہ اور نگاہ کرم فرمائی ہوگی جیسی کسی عزیز شاگرد اور گوہر قابل پر ہوتی ہے۔

حضرت مولانا نے اس ڈیڑھ سال کے عرصہ میں حضرت شاہ صاحب سے کیا کیا پڑھا، اس کی جو تفصیلات حضرت شاہ صاحب کی تحریر فرمائی ہوئی سند سے معلوم ہوتی ہیں، وہ حیرت میں ڈالنے والی ہیں۔ حضرت مولانا نے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں تفسیر، فقہ اور اصول حدیث کی بائیس کتابوں کی قرأت وسماعت فرمائی (تیرہ کتابوں کی مکمل قرأت کی، آٹھ کتابوں میں جماعت اور شرکاء کی رفاقت میں سماعت وقرأت دونوں سے بہرہ ور ہوئے، صرف ایک کتاب (شرح نخبۃ الفکر) ایسی ہے جس میں قرأت کا موقع نہیں ملا صرف سماعت ہوئی۔ جن کتابوں کی اوّل سے آخر تک حضرت مولانا نے خود قرأت کی، وہ یہ ہیں:

(۱) سنن ترمذی	(۲) سنن نسائی
(۳) ابن ماجہ	(۴) تیسیر الاصول
(۵) موطاء امام محمد	(۶) شمائل ترمذی
(۷) مسند امام ابوحنیفہؒ	(۸) عدۃ الحصن الحصین

ان کے علاوہ تفسیر کی چند اہم کتابوں کے مختلف حصے (غالباً مختلف مقامات سے) حضرت شاہ صاحب سے پڑھے، ان کی قرأت بھی خود ہی فرمائی ان کے نام یہ ہیں:

(۹) معالم التنزیل بغوی	(۱۰) تفسیر بیضاوی
(۱۱) جلالین	(۱۲) تفسیر جامع البیان
(۱۳) تفسیر رحمانی	

کچھ کتابوں کی حضرت مولانا نے قرأت بھی کی اور دوسرے رفقاء کی قرأت سے سماعت بھی فرمائی اور ان سب کی باضابطہ اجازت سے معزز ومفتخر ہوئے۔ وہ یہ ہیں:

(۱۵) صحیح بخاری   (۱۶) صحیح مسلم
(۱۷) سنن ابوداؤد   (۱۸) مسند دارمی
(۱۹) جامع صغیر   (۲۰) مشکوٰۃ المصابیح
(۲۱) حصن حصین   (۲۲) حزب الاعظم

حضرت شاہ صاحب کی توثیق

یہ معلومات حضرت شاہ محمد اسحاق کی عطا فرمائی ہوئی سند سے حاصل ہورہی ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

ان الحافظ الموصوف، قرأطرفاً من الصحیح البخاری وطرفا سمع بقرأة الغیر علی، وکتاب تیسیر الاصول والجامع لابی عیسیٰ الترمذی وشمائله، وکتاب النسائی ،وابن ماجه القزوینی، والموطا للامام محمد بن الحسین الشیانی، ومسند ابی حنیفه من روایة الحصکفی، والعده لمحمد بن محمد الجزری صاحب الحصن الحصین، قرأة علی من اولها الی آخرها بلامشارکة الغیر فی القرأة.

وکتاب الصحیح لمسلم، وسنن ابی داؤد، ایضاب اسندهما علی بتمامهما قراة وسماعة.

ومسند الدارمی قرأ علی قدرا معتدا، وشیأ من الجامع الصغیر للسیوطی ، ومشکوٰة المصابیح، والحصن الحصین، والحزب الاعظم والورد الافخم لعلی القاری، وایضا سمع بقرأة الغیر علی شرح النخبة فی اصول الحدیث.

وقرأ علی من التفاسیر شیأ من المعالم للبغوی والبیضاوی والجلالین، وجامع البیان ، والتفسیر الرحمانی.

ترجمہ : یہ کہ حافظ موصوف (مولانا احمد علی) نے بخاری کے اوّل آخر کے کچھ حصے میرے سامنے پڑھے اور کچھ حصے کسی اور (ہم سبق) کی قرأت سے مجھ سے سنے۔ اور

کتاب تیسیر الاصول، اور امام ابوعیسیٰ ترمذی کی کتاب جامع (سنن ترمذی) اور ان ہی کی شمائل نبوی اور امام نسائی کی کتاب (سنن صغری) اور سنن ابن ماجہ قزوینی، اور موطا امام محمد بن حسن شیبانی اور مسند امام ابوحنیفہ حصکفی کی روایت سے، اور عدۃ (الحصن الحصین) محمد بن محمد جزری، مؤلف حصن حصین کی، مجھ سے شروع سے آخر تک پڑھیں، اس طرح کہ ان کی قرأت میں ان (مولانا احمد علی) کے علاوہ کوئی اور شریک نہیں تھا۔ اور سند کتاب صحیح مسلم اور سنن ابوداؤد بھی مجھ سے شروع سے آخر تک مکمل طور پر حاصل کیں، ان کی قرأۃ اور سماعت دونوں میں شریک رہے۔

اور مسند دارمی کا خاصا حصہ مجھ سے پڑھا اور جامع صغیر سیوطی اور مشکوٰۃ المصابیح اور حصن حصین اور حزب الاعظم الورد الافخم ملا علی قاری کے کچھ حصے بھی مجھ سے پڑھے۔ نیز اصول حدیث میں شرح نخبۃ الفکر مجھ سے پڑھی جس کی کسی اور نے قرأت کی تھی، اور مجھ پر تفاسیر کے کچھ حصے معالم التنزیل، بغوی کی تفسیر (انوار التنزیل) بیضاوی کے تفسیر جلالین کے اور جامع البیان کے، نیز تفسیر رحمانی کے پڑھے۔

مولانا نے حضرت شاہ صاحب سے تحقیق و تفصیل سے پڑھا تھا، جزوی اور رواں نہیں پڑھا

حضرت مولانا کی حضرت شاہ صاحب کی صحبت و مجلس میں ان کتابوں کی تعلیم اور قرأت و سماعت ایسی نہیں تھی جس کا عام طور سے معمول تھا کہ شاگردوں نے متون کتاب کی قرأت و سماعت کی، حضرت استاد تشریف فرما رہے، کبھی کہیں کچھ کہہ دیا، قرأت جاری رہی۔ اسی طرح کتاب مکمل ہوگئی اور جناب استاد نے اس کی روایت کی اجازت عطا فرمادی۔ حضرت مولانا احمد علی نے حضرت شاہ صاحب سے ان تمام کتابوں کا ایک ایک سبق جملہ مطالب و مباحث کی تفہیم و تحقیق، اہم مسائل کے طریق استنباط، جملہ روایات اور فقہی مذاہب کے مستدلات کی وضاحت کے ساتھ پڑھا تھا۔ حضرت مولانا کے ایک شاگرد مولانا سید دیدار علی الوری اور سرسید احمد خاں نے اپنی تحریروں میں اس کی وضاحت کی ہے۔ مولانا سید دیدار علی نے لکھا ہے:

''مولانا احمد علی مرحوم و مغفور سہارنپوری نے مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی کے ساتھ، تمام کتب صحاح ستہ وغیرہا، مع طریق استنباط مسائل ضروریہ اور طریق موافق کرنے روایت فقہی کے قرآن وحدیث کے ساتھ پیش کی مولانا شاہ محمد اسحاق پر'' (۱)

سرسید احمد نے اپنے خاص انداز میں اسی بات کو اور قوت سے لکھا ہے۔ یہاں یہ وضاحت مفید ہوگی کہ جب مولانا احمد علی دہلی میں تصحیح کتب حدیث اور ان کی طباعت میں مصروف تھے، اس وقت سرسید احمد دہلی کے منصف تھے۔ سرسید احمد کے الفاظ درج ذیل ہیں:

''انھوں نے حدیث کو اس طرق پر حاصل نہیں کیا تھا، جس طرح اکثر علماء کا دستور ہے کہ سند کے سلسلے کو درست کرنے کی نیت سے، کسی کتاب کے چند ورق یا چند جز کسی صاحب سند عالم سے پڑھ لئے اور بے فکر ہو گئے۔

جناب مولوی احمد علی صاحب مرحوم نے تمام کتب صحاح اور بعض دیگر کتب حدیث کو من اولہ الی آخرہ جناب مولوی محمد اسحاق صاحب سے سبقاً سبقاً پڑھا تھا، اور جب کہ مولوی محمد اسحاق صاحب نے دہلی سے ہجرت فرمائی تو مولوی احمد علی بھی مکہ معظمہ میں تشریف لے گئے، اور خاص حرم بیت اللہ میں حدیث کی کتابوں کو مولوی محمد اسحاق سے تمام کیا (۲)

(۱) میزان الادیان لما فیہ من الزیادۃ والنقصان (تفسیر قرآن مجید) مولانا سید دیدار علی الوری ص:۸۱/ جلد اوّل (طبع اوّل، لاہور بلا سنہ) یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا سید دیدار علی الوری، مولانا پیر مہر علی شاہ گولڑوی اور مولانا وصی احمد محدث تینوں مظاہر علوم کے سنہ ۱۲۹۲ھ کے فارغ ہیں۔ تینوں ہم سبق تھے۔ تینوں مولانا احمد علی محدث، اور مولانا محمد مظہر نانوتوی کے شاگرد ہیں۔ مولانا سید دیدار علی کو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے بھی تلمذ اور اجازت حدیث ہے۔ مولانا دیدار علی نے میزان الادیان میں اپنی مذکورہ بالا تحریر میں یہ بھی لکھا ہے کہ میں نے سنہ ۱۲۹۲ھ میں مظاہر علوم میں پچیس طلباء کے ساتھ حضرت مولانا احمد علی سے حدیث شریف پڑھی تھی اور اس کی اجازت وسند حاصل کی تھی۔

(۲) سائنٹیفک میگزین۔ مدیر سرسید احمد، شمارہ ۱۶/ اپریل ۱۸۸۰ء (یہ شمارہ راقم سطور نے دیکھا ہے) نیز ملاحظہ ہو: سرسید احمد کی تعزیتی تحریریں، مرتبہ اصغر عباس۔ ص: ۱۶۱۵ (علی گڑھ: ۱۹۸۹ء)

حضرت شاہ صاحب کی عطا کی ہوئی سند

حضرت مولانا احمد علی کی حدیث شریف کی قرأت وسماعت سے فراغت پر حضرت شاہ محمد اسحاق نے مکہ معظمہ میں جو سند عنایت فرمائی تھی اس کا اہم حصہ اوپر آچکا ہے، یہاں وہ پوری سند درج کی جاتی ہے۔ اس سند سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی نگاہ میں مولانا احمد علی کا مرتبہ عام شاگردوں اور عام حدیث پڑھنے والوں سے بلند تھا۔ حضرت شاہ صاحب سمجھتے تھے کہ حضرت مولانا احمد علی خدمت حدیث میں اپنے اکثر معاصرین اور اقران پر فائق ہوں گے۔ حضرت شاہ صاحب نے مولانا کا ''الشیخ الناسک الحافظ احمد علی السھارنفوری'' اور ''الحافظ الناسک الشیخ احمد علی'' کے مناسب تعظیمی الفاظ سے تذکرہ کیا ہے۔ سند ملاحظہ ہو:

حضرت شاہ محمد اسحاق کی عطا فرمائی ہوئی سند واجازت کا مکمل متن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدلله رب العالمين، والصلوٰة والسلام على سيد المرسلين وعلىٰ آله وصحبه اجمعين.

امابعد! فيقول العبد الضعيف محمد اسحاق عفى الله عنه، ان الشيخ الناسک الحافظ احمد على السهارنفورى، قد حصّل قرأة كتب الحديث وسمعها عندى فى مكة المعظمه، زادها الله شرفا وتكريما بهذاالتفصيل:

ان الحافظ الموصوف قراة طرفا من الصحيح البخارى، وطرفاً سمع بقرأة الغير على، وكتاب تيسيرالاصول، والجامع لابى عيسىٰ الترمذي وشمائله ،وكتاب النسائى وابن ماجه القزوينى ، والموطا للامام محمد بن الحسن الشيبانى، ومسندابى حنيفه من رواية الحصكفى، العده لمحمد بن محمد الجزرى صاحب الحصن الحصين، قرأة على من

اولها الى آخرها بلا مشاركة الغير فى القرأة. وكتاب الصحيح لمسلم، وسنن ابى داؤد ايضا، اسند هما على بتمامها قرأة وسماعة.

ومسند الدارمى قرأ على قدراً معتداً وشيئاً من الجامع الصغير اليسوطى، ومشكوٰة المصابيح والحصن الحصين، والحزب الاعظم والودر الافخم لعلى القارى.

وايضا سمع بقرأة الغير على، شرح النخبة فى اصول الحديث وقرأعلى من التفاسير شيئاً من المعالم للبغوى، والبيضاوى، والجلالين، وجامع البيان، والتفسير البيان.

وحصل لى الاجازة والقرأة والسماعة من الشيخ الاجل الحبر الابجل الذى فاق بين الافاق بالتميز اعنى الشيخ عبدالعزيز رحمه الله تعالىٰ، وحصل له الاجازة والقرأة والسماعة، من والده الشيخ ولى الله بن الشيخ عبدالرحيم الدهلوى واسانيداكثر الكتب موجودة فى تصانيفه.

وقد اجزت الحافظ الناسک، الشيخ احمد على، لقرأة الكتب المذكورة ان يشتغل بها، ويعلم المستفيدين بالشروط المعتبرة عند اهل الحديث، والله المستعان وعليه التكلان، وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين. (مهر) محمد اسحاق ۱۲۵۸ھ

سند کا ترجمہ | تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جو دونوں جہانوں کا پالنے والا ہے اور درود وسلام ہو سید المرسلین (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل اور اصحاب پر۔

(۱) اس سند کی نقل (یا اصل تحریر) حضرت مولانا احمد علی کے فاضل فرزند مولانا خلیل الرحمٰن (جو ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم بھی رہے) نے حضرت مولانا احمد علی کے مختصر حالات کے ساتھ علامہ سید سلیمان ندوی کو عنایت کی تھی۔ یہ حالات اور سند علامہ سید سلیمان نے علامہ شبلی نعمانی کے حضرت مولانا احمد علی سے تلمذ کے تذکرہ میں درج کئے ہیں۔ ملاحظہ ہو: حیات شبلی ص:۸۶/۸۷ (اعظم گڑھ:۱۹۹۹ء)

اس کے بعد! بندہ ضعیف محمد اسحاق، اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمائے، کہتا ہے کہ شیخ عابد حافظ احمد علی سہارنپوری کو مکہ معظّمہ (اللہ تعالیٰ اس کے شرف ومکرم کو زیادہ فرمائے) میں میرے پاس کتب حدیث کے پڑھنے اوران کے سننے کا موقع ملا ہے (پڑھنے اور قرأت وسماعت کی) اس تفصیل کے ساتھ:

یہ کہ حافظ موصوف (مولانا احمد علی) نے بخاری کے اوّل وآخر کے کچھ حصے میرے سامنے پڑھے اور کچھ حصے کسی اور (ہم سبق) کی قرأت سے مجھ سے سنے اور کتاب تیسیر الاصول، اور امام ابوعیسیٰ ترمذی کی کتاب جامع (سنن ترمذی) اوران ہی کی شمائل نبوی اور امام نسائی کی کتاب (سنن صغری) اور سنن ابن ماجہ قزوینی، اور موطا امام محمد بن حسن شیبانی اور مسند امام ابوحنیفہ، حصکفی کی روایت سے، اور عدۃ (الحصن الحصین) محمد بن محمد جزری موطا حصن حصین کی مجھ سے شروع سے آخر تک پڑھیں، اس طرح کہ ان کی قرأت میں ان (مولانا احمد علی) کے علاوہ کوئی اور شریک نہیں تھا۔

اور کتاب صحیح مسلم اور سنن ابوداؤد بھی مجھ سے شروع سے آخر تک مکمل طور پر حاصل کیں، ان کی قرأۃ اور سماعت دونوں میں شریک رہے۔

اور مسند دارمی کا خاصا حصہ مجھ سے پڑھا، اور جامع صغیر سیوطی اور مشکوٰۃ المصابیح اور حصن حصین اور حزب الاعظم اور الورد الأفخم ملا علی قاری کے کچھ حصے بھی مجھ سے پڑھے۔ نیز اصول حدیث میں شرح نخبۃ الفکر مجھ سے پڑھی جس کی کسی اور نے قرأت کی تھی۔ اور مجھ پر تفاسیر، معالم التنزیل بغوی کے (انوار التنزیل) تفسیر بیضاوی کے، تفسیر جلالین کے، اور جامع البیان کے نیز تفسیر رحمانی کے کچھ حصے پڑھے۔

اور مجھے (کتب حدیث وتفسیر سب ہی کی) اجازت اور قرأت سماعت علامہ اجل، علم کے دریائے بے پایاں، جو اپنے عہد میں فضل وکمال میں ممتاز ونمایاں تھے، یعنی شیخ عبدالعزیز (اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے) سے حاصل ہے، اوران کو اسی طرح اجازت اور قرأت وسماعت (کی سعادت) اپنے والد ماجد شاہ ولی اللہ بن شیخ عبدالرحیم دہلوی سے حاصل تھی، اوران کی اکثر سندیں ان کی تصانیف میں موجود ہیں۔ اور بلاشبہ میں نے

حافظ عابد، شیخ احمد علی کو ان سب کتابوں کے پڑھنے (پڑھانے) کی اجازت دی ہے کہ ان (کی تعلیم وخدمت) میں مشغول ہوں اور استفادہ کرنے والوں کو پڑھائیں، ان سب شرائط کی پابندی اور رعایت کے ساتھ جو علمائے حدیث کے یہاں (معمول اور اجازت حدیث کے لئے) معتبر ہیں۔

اللہ تعالیٰ مدد فرمانے والے ہیں، ان ہی پر بھروسہ ہے، اور آخری بات اور کلمہ یہ ہے کہ تمام تعریفیں حق تعالیٰ کے لئے ہیں وہی سب جہانوں کا پالنے والا (اور والی ومددگار) ہے۔

مہر محمد اسحاق ۱۲۵۸ھ

(ترجمہ: نورالحسن راشد کاندھلوی)

شاہ صاحب نے مولانا کو رخصت کرتے وقت خدمت حدیث کی وصیت کی

حضرت شاہ صاحب نے مولانا کو مکہ مکرمہ سے رخصت کرتے ہوئے خدمت حدیث میں مشغول رہنے کی ہدایت بلکہ وصیت فرمائی تھی۔

حضرت مولانا احمد علی نے اس کا ان الفاظ میں تذکرہ فرمایا ہے:

ثم لما كان شغفي بخدمت الحديث النبوی بما اوصانی بها مرشدی ومولائی ذوالنفس القدسية والصفات الملكية، والمحتد الطاهر والمفخر الظاهر، المشهور بالفضل فی الآفاق قدوة اهل الوفاق، مولانا الحاج محمد اسحاق. (۱)

حضرت مولانا احمد علی نے اس وصیت کی ایسی پاسداری فرمائی کہ خدمت حدیث میں حضرت مولانا کی کوئی نظیر اور ثانی نہ ان کے معاصرین مین تھا، اور نہ بعد کے دور میں اس شان اور مرتبہ کا کوئی اور خادم حدیث نمودار ہوا۔ برصغیر کی دینی علمی تاریخ سے واقف ہر وہ شخص جو منصف مزاج ہے اور کسی دینی یا علاقائی تعصب میں حق وصداقت کا خون نہیں کرتا، اس کی تصدیق کرے گا کہ کتب حدیث کی اس دیدہ ریزی سے تصحیح، ان کے متون کی اعلیٰ درجہ کی تحقیق وتنقیح، ان پر غیر معمولی حواشی لکھ کر اسی شان سے اشاعت میں کم سے کم اسی تحتی برصغیر میں حضرت مولانا کی کوئی مثال نہیں۔ بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ جب حضرت مولانا اس خدمت پر متوجہ ہوئے

(۱) خاتمۃ الطبع صحیح بخاری۔ مرتبہ حضرت مولانا احمد علی محدث ص: ۱۱۲۹ جلد ثانی (عکس طبع نور محمد دہلی

اس وقت پورے عالم اسلام کے لئے یہ ایک نیا پیغام اور نئی سوغات تھی، اگرچہ بعد میں مختلف پہلوؤں سے اس کام کو آگے بڑھایا گیا اور اس میں نئے نئے ابواب وعناوین کا اضافہ ہوا اور تحقیق اور شرح وحواشی کے نہایت دقیع اور بابرکت نمونے سامنے آئے مگر حضرت مولانا احمد علی کی خدمات کی جو اولیت اور معنویت اور اہمیت تھی، وہ اب بھی اسی طرح قائم اور بے مثال ہے۔ ذالک فضل الله یؤتیه من یشاء۔

حضرت مولانا نے حضرت شاہ صاحب کی وصیت کی کس کس طرح تعمیل کی

حضرت مولانا نے استاد محترم کی اس ہدایت ووصیت کو وسیع معنوں میں لیا اور اس وقت خدمت حدیث کی جو صورتیں ہوسکتی تھیں ان سب پر عمل کی کوشش کی، جس میں قدیم طریقہ پر درس حدیث کا اہتمام بھی تھا۔ حضرات محدثین کی روایات پر عمل فرماتے ہوئے ان کے اصول اور نشان راہ کی روشنی میں، حدیث شریف کی معروف اور معتبر ترین کتابوں، خصوصاً صحاح ستہ اور مشکوٰۃ شریف وغیرہ کے متون کی پرانے معتبر ومصدقہ قلمی نسخوں سے مطابقت وتصحیح بھی تھی، بڑے بڑے خادمان حدیث کی پیروی میں کتب حدیث پر فاضلانہ تحقیقات سے پُر محدثانہ حاشیہ نگاری بھی تھی، اور اس وقت کی جدید ترین روایت اور تازہ ایجادات سے استفادہ کرتے ہوئے ان کتابوں کی ایسی عمدہ اشاعت وطباعت بھی جو پوری دنیائے حدیث خصوصاً برصغیر کے علماء کرام اور طالبان حدیث کے لئے نمونہ اور مثال بن جائے۔ حضرت مولانا نے یہ کام نہ صرف اپنے عہد کے بلکہ مستقبل بعید کے اکیڈیمک طریقہ کے مطابق انجام دیا۔ اس کے لئے نہایت ذی استعداد، ذی علم اور باذوق افراد یک جا کئے، ان کو اپنی صحبت کا شرف بخشا، علمی کاموں کے آداب واطوار سکھائے، پھر ان کو اپنے ساتھ بلکہ اپنے کام میں مختلف حیثیتوں سے شامل رکھ کر، علمی کاموں میں حصہ دار بنایا جس سے ان کے علم میں ترقی ہوئی اور تحریر وتصنیف کا تجربہ حاصل ہوا، ائمہ کبار کی کتابوں سے نقل وانتخاب کی سعادت میسر آئی اور بعد میں علمی قافلوں کی قائدانہ رہنمائی کی توفیق بھی نصیب ہوئی۔

حضرت مولانا احمد علی جب حضرت شاہ محمد اسحاق کے فیضان سے لبریز ہوکر ہندوستان واپس آئے اس وقت حضرت مولانا نوعمر اور نوجوان نہیں تھے کہ مولانا کو دینی تعلیم وصلاحیت میں نکھار پیدا کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی، اور اس کے لئے وہ ابتدائی درجہ کے کسی مدرسہ سے وابستگی اختیار کرکے ادنی یا متوسط درجہ کی کتابوں کی تعلیم سے اپنے نئے علمی سفر یا بحیثیت استاد ومعلم نئی زندگی کا آغاز فرماتے، بلکہ

جب حضرت مولانا ہندوستان واپس ہوئے اس وقت مولانا کی عمر تقریباً سینتیس سال تھی (ولادت ۱۲۲۵ھ واپسی تقریباً ۱۲۶۲ھ) اور وہ اس وقت ایک تجربہ کار عالم صاحب نظر محدث اور فاضل تھے۔

اوپر گزر گیا ہے کہ مولانا حضرت شاہ صاحب کی ہندوستان میں موجودگی کے وقت بھی سنہ ۱۲۵۸ھ میں شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو چکے تھے اور اس سے پہلے فرخ آباد میں مقیم تھے۔ اگرچہ اس وقت کی مصروفیات کا پورا حال دریافت نہیں مگر قرائن کہہ رہے ہیں کہ حضرت مولانا وہاں بھی درس وافادہ میں مصروف رہے ہوں گے۔ اس پہلو سے اگر دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت مولانا، حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں مکہ مکرمہ حاضری سے پہلے تقریباً چودہ پندرہ سال تک درس وافادہ میں مشغول رہ چکے تھے، جس سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت مولانا کی علمی استعداد جو بہت عمدہ اور اعلیٰ درجہ کی تھی متواتر درس وتعلیم کی وجہ سے خوب منجھ گئی ہوگی اور حضرت شاہ صاحب کی برکت سے اس پر جو چمک اور آب آئی اس کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ ایسے بحر زخار استاد، ایسے ہی باخبر صاحب نظر فاضل شاگرد! شاید مولانا کی اسی لیاقت وصلاحیت کی وجہ سے حضرت شاہ محمد اسحاق نے حضرت مولانا کو الشیخ الحافظ الناسک جیسے الفاظ سے یاد فرمایا ہے۔

حجاز سے ہندوستان واپسی

حضرت مولانا کی ہندوستان واپسی، دہلی قیام اور درس حدیث کا آغاز خصوصاً سہارنپور اور دہلی پہنچنے کی تاریخ معلوم نہیں۔ قیاساً کہا جا سکتا ہے کہ غالباً سنہ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) کے درمیانی یا آخری مہینوں میں واپس ہوئے ہوں گے۔ مولانا کی بعض تحریروں سے اس کی شہادت ملتی ہے کہ مولانا سنہ ۱۲۶۲ھ کے تقریباً وسط میں مستقل قیام کے ارادہ سے دہلی آگئے تھے۔

دہلی میں مسند درس

حضرت مولانا نے دہلی میں جو مسند درس سجائی تھی وہ کہاں تھی؟ اس کے ابتدائی دور میں کون کون اصحاب شامل تھے؟ انھوں نے حضرت مولانا سے کس زمانہ میں کیا کیا پڑھا؟ اور حضرت مولانا کے یہاں کون کون سی کتابوں کے اجمالی یا تفصیلی درس کا معمول تھا؟ سراغ نہیں ملا۔ لیکن حضرت مولانا نے اپنی مرتبہ صحیح بخاری کے اختتام پر جو تحریر ثبت کی ہے، اس میں کثرت درس وافادہ کی وجہ سے تعلیم وحاشیہ کے کام کے لئے قلت فرصت کا عذر کیا ہے۔ جس سے اندازہ

ہوتا ہے کہ حضرت مولانا کی درس حدیث کی مشغولیت ایسی وسیع تھی کہ اس کی وجہ سے صحیح بخاری پر جو کام کررہے تھے اس کے لئے بعض مرتبہ وقت نکالنا دشوار ہوجاتا تھا۔ حضرت مولانا نے لکھا ہے:

"ولما لم يتيسر لى فرصة بسط الكلام، حسب مايتضح به المرام لهجوم الاشغال المتعلقة بالمطبع، وتعجيل الطلاب الذين غاصوا فى بحار درس الكتاب وتاكيدها الى الطبع وغيره من الاسباب"(۱)

ترجمہ: اور چوں کہ مجھے بات کی بہت وضاحت کی فرصت نہیں ملی، ایسی کہ اس سے سب مقاصد پورے ہوجائیں (اور تمام شبہات وسوالات حل ہوجائیں) مطبع سے متعلق مصروفیات کے ہجوم اور ان طلبہ کی جلدی کی وجہ سے جو کتاب کے درس میں غواصی کررہے تھے، وغیرہ اسباب کی وجہ سے۔

دہلی کا علمی مقام، یہاں کے حلقہائے درس اور مولانا کی مسند تعلیم

اگر چہ اس وقت خاندان حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے مدارس سے براہ راست استفادہ اور فیضیابی کا دروازہ بند ہوچکا تھا، مگر وہ بہت سے ستارے جو اس کہکشاں کے انوار سے منور ہوکر بذات خود آفتاب وماہتاب بن گئے تھے، دہلی کے علمی افق پر ضوفشاں تھے، ان کی تابندگی نگاہوں کو خیرہ کررہی تھی۔ اور ان کے دریائے علم کا شہرہ ایک دنیا کو ان کا والہ وشیدا بنائے دہلی کی طرف لا رہا تھا۔ اس لئے ہر اک عالم کو اس کا حوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ دہلی کو اپنی علمی فکری تگ وتاز کا میدان بنائے۔ یہاں اپنا حلقہ درس قائم کرے اور اس کو عروج وفروغ بھی حاصل ہوجائے۔

دہلی کے علما اور اہل نظر کی تو بات ہی اور تھی، یہاں تو بعض اوقات طلبہ بھی ایسے منجھے ہوئے اور لائق فائق آتے تھے کہ اچھے اچھے مدرسین اور اساتذہ کو بھی اپنا علم اور مطالعہ تازہ کرنا پڑتا تھا، ایسے میں حضرت مولانا احمد علی کا دہلی میں درس حدیث کا اہتمام فرمانا بذات خود ایک بڑی بات تھی اور اس حلقہ درس کی طلباء کی جانب سے پذیرائی اور دہلی جیسے شہر علم میں، جہاں دسیوں علماء کے علم کدے شائقین علم وکمال کو سرشار وفیضیاب کررہے تھے، حضرت مولانا کی خاص مقبولیت اس کی گواہ ہے کہ حضرت مولانا کا درس حدیث علم معمولی نوعیت کا درس نہیں تھا بلکہ خاصے کی چیز ہوتا ہوگا۔

(۱) خاتمۃ الطبع، صحیح بخاری ص: ۱۱۲۹ جلد ثانی

جس حلقہ درس میں بیٹھ کر قاسم العلوم حضرت محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ اور اسی قد وقامت کے دسیوں اصحاب معطر ومشک بار ہو گئے ہوں، اس کا علمی مرتبہ ومنزلت محتاج بیان نہیں۔ دہلی میں حضرت مولانا کا درس کس شان کا ہوتا تھا، اس کی صراحت راقم سطور کے علم میں نہیں، لیکن سہارنپور میں مولانا کے خزانہ علم سے جو دولت عام ہوئی وہ کس قدر ومرتبہ کی تھی اور دنیائے علم میں اس کی کیسی گراں قیمت تھی، اس کا کچھ اندازہ مولانا کے طریقۂ درس وتعلیم میں آئے گا، انشاء اللہ تعالیٰ!

متون حدیث کی تدوین، تصحیح وحواشی پر حضرت مولانا کی خدمات مختصر اشارات

درس حدیث کے آغاز کے ساتھ حضرت مولانا نے کتب حدیث خصوصاً صحیحین (بخاری ومسلم) سنن ترمذی اور مشکوٰۃ المصابیح کے متون کی تصحیح اور ان پر اعلیٰ درجہ کے حواشی مرتب کرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ درس وتعلیم کی مصروفیت اور تحقیق وتصنیف کا عمل ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ ایک جانب مولانا کے حلقۂ درس نے محقق وباخبر اور ایسے صاحب نظر علماء پیدا کئے جو بعد میں اس برصغیر میں حدیث کے اعلیٰ ترین فاضل، جید محدث، محقق مصنف، متکلم بلکہ کشتی ملت کے ایسے ناخدا ثابت ہوئے جنھوں نے سخت نامساعد حالات میں اس کشتی کی پتوار سنبھالے رکھی اس کو گرداب حوادث اور طوفان کی زد سے صاف نکال لائے۔ اکثر یہی علماء تھے جنھوں نے ہندوستان میں مدارس اسلامیہ قائم کئے، دین کے مختلف پہلوؤں کو زندہ رکھا اور علم وعمل کی دنیا اور اتباع شریعت کے میدانوں میں نئے گل وگلزار آباد کئے، جس کے اثر اور برکت سے ہماری دینی فضائیں اور ماحول آج تک معطر اور مشکبار ہیں۔

دوسری جانب حضرت مولانا نے دین وحدیث کی خدمت کا جو ارادہ کیا تھا، وہ بھی مولانا کے منصوبوں کے مطابق اور ایسے عمدہ طریقہ پر پورا ہوا کہ اس نے بھی ہندوستان بلکہ دنیا بھر کی خدمت حدیث کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ حضرت مولانا نے اپنے کام کا آغاز بخاری شریف کے متون کی تصحیح سے کیا، اس پر گراں بہا حاشیہ تحریر فرمایا، اس کے ساتھ ہی صحیح مسلم پر توجہ کی، اس کے حاشیہ پر امام نووی کی شرح صحیح مسلم کا مکمل متن درج کیا، سنن ترمذی کی تصحیح کی اس پر بھی حاشیہ لکھا، مشکوٰۃ المصابیح پر بھی حاشیہ رقم کیا، سنن ابوداؤد کا ایک نہایت عمدہ نسخہ جو مولانا کا مرتبہ اور مصححہ تھا، مولانا نوازش علی نے شائع کیا، اور بھی بہت سی کتابوں کو اپنے افادات سے مملو فرما کر ان کی عمدہ طباعت کا اہتمام وانصرام کیا۔ یہ سب کام ایسے تھے کہ ان میں سے ہر ایک متن کی تصحیح کے لئے برسوں کی دیدہ ریزی اور نہایت وسیع اور نہایت گہری محدثانہ نظر کا طالب تھا۔ حضرت

مولانا کا کام صرف تصحیح متن تک محدود نہیں، حضرت مولانا نے ہر ایک کتاب پر نیا تازہ جامع حاشیہ لکھا، جو اس کتاب کی جملہ شروح کا بہترین عطر، مباحث ومسائل کا جوہر اور حسن انتخاب کا بے نظیر نمونہ ہے۔ پھر ہر ایک کتاب کے ساتھ اس کتاب کے شایان شان علمی مقدمہ اور بعض اہم متعلقات ومسائل کا اضافہ بھی کیا، اور ان میں سے ہر ایک کام ایسا ہے کہ کوئی پوری زندگی لگا کر بھی اس درجہ کا ایک کام بھی کر لے تو بلاشبہ اس کو یہ کہنے کا حق ہوگا کہ: شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم۔

اگر کوئی عالم حضرت مولانا کے کام کو سامنے رکھے بغیر اس طرح کے کام کا ارادہ کریں تو ان کو اندازہ ہوگا کہ یہ ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا عمل حضرت مولانا سے کیسے انجام پایا اور حضرت مولانا نے اس سخت دشوار گزار منزل کو کیوں کر نہایت سرعت اور آسانی سے گویا لمحوں میں طے کر لیا؟ کہاں کہاں سے پھول چنے اور ان کا کیسا معطر سدا تر وتازہ صدرنگ اور پر بہار گلدستہ سجا دیا۔ بہر حال حضرت مولانا ان تمام کاموں سے جو بہت بڑے نہایت غیر معمولی اور نہایت نازک تھے، بہت کم وقت تقریباً دس سال میں (۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ء تک) بالکل فارغ ہو چکے تھے:

کام تھے عشق میں بہت پر، میر
ہم ہی فارغ ہوئے شتابی سے

یہی خدمت حضرت مولانا کی زندگی کا محور اور ان کے کمالات میں سب سے بڑا کمال ہے، یہی کام ہے جس نے مولانا کو بقائے دوام کی خلعت عطا کی اور ان شاء اللہ تعالیٰ یہی کام امت کے لئے ایک بڑا اُسوہ، تحفہ اور نادر ورثہ ہے جس کی خوشبو سے علم کا گلستاں معطر ومشک بار ہے اور خدمت حدیث کے چمن میں بہار آئی ہے۔ آئندہ صفحات میں سب سے پہلے اسی کا ذکر کیا جائے گا۔

تصحیح صحیح بخاری کا مرحلہ

ہندوستان واپسی کے بعد تصنیفی اشاعتی منصوبہ میں اہم اور نازک ترین خدمت صحیح بخاری کے قلمی نسخوں، حواشی اور شرح کے نہایت دقت نظر اور احاطہ کے ساتھ مطالعہ اور کامل تحقیق وتدقیق کے بعد صحیح نسخہ مرتب کرنے کا تھا۔ بخاری شریف کی ایک ایک روایت بلکہ ایک ایک لفظ ایک ایک حرف کی تصحیح کس قدر نازک کام ہے اس کی اہمیت، معنویت، محنت اور غیر معمولی دیدہ ریزی کا صرف ان ہی اہل علم کو کچھ اندازہ ہو سکتا ہے جن کا کسی ایسے بڑے اور اہم علمی کام اور تصحیح متن کے عمل سے سابقہ رہا ہو۔ بخاری شریف کی تصحیح اور صحیح نسخہ مرتب کرنے اور متعدد ذرائع سے حاصل

متفرق روایات واطلاعات کو چھان پھٹک کے بعد قبول یا رد کرنے کا کام دانتوں پسینہ لانے کا کام ہے جس میں ایک حرف کے لئے اس کے تمام لغوی، نحوی صرفی استعمالات، زبان وادب کی دنیا میں اس کے نظائر، بدیع ومعانی کے فنون میں اس کی معنویت اور سب سے بڑھ کر حدیث شریف کے ناپیدا کنار سمندر میں ڈوب کر اس کی گہرائی ائمہ اعلام اور محدثین کے الفاظ تحقیقات وتعلیقات اور اس سے متعلق جملہ معلومات کے پوری طرح مطالعہ کے بعد ہی اسکا فیصلہ اور انتخاب کیا جائے گا اور پھر جس کتاب کا مرتبہ کتاب اللہ العزیز کے بعد دنیا کی سب کتابوں میں سب سے عالی اور دین وشریعت کے لئے کلید واساس کی حیثیت رکھتا ہو اس کے لئے کس قدر احساس ذمہ داری اور احتیاط کی ضرورت ہے، حضرت مولانا نے اس کا پورا احتمال ہی نہیں رکھا بلکہ بخاری شریف جیسی عظیم الشان جلیل القدر کتاب، جس کی ضخامت بھی غیر معمولی ہے کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔

بہرحال حضرت مولانا نے سب سے پہلے بخاری شریف کے متن کی تصحیح وتدوین پر توجہ فرمائی۔ اختلاف روایات حاشیہ پر ثبت فرمایا۔ پھر مفصل حاشیہ تحریر کیا۔ اس غیر معمولی اور تھکا دینے والی مصروفیت کے باوجود حضرت مولانا نے خدمت حدیث کے اسی ایک شعبہ کو اپنی کوششوں کا محور نہیں بنایا بلکہ خدمت حدیث وعلوم کے اور پہلوؤں پر بھی پوری پوری توجہ رہی، درس وتعلیم کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ نیز بخاری شریف کے علاوہ حدیث فقہ اور تفسیر کی متعدد کتابوں کی تصحیح ومقابلہ اور ان پر حاشیہ لکھنے کا عمل بھی روز افزوں رہتا تھا۔

شاملی، تھانہ بھون اور آس پاس کے علاقہ

ضلع مظفر نگر یوپی کی چند بستیوں

میں سنہ ۱۸۵۷ء کے جہاد اور معرکہ آرائی کی روداد

اس وقت کے انگریز افسران کے قلم سے

تمہید .... از نور الحسن راشد کاندھلوی

سنہ ۱۸۵۷ء کی انقلابی تحریک، ہندوستان بلکہ برصغیر ہند کی دینی ملی علمی سیاسی تاریخ کا ایک اہم عنوان اور نا قابل فراموش حصہ ہے، یہ تحریک آندھی اور طوفان کی طرح اٹھی اور بجلی کی لہروں کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی، جن مقامات پر اس تحریک کو خالص مذہبی بنیادوں پر اٹھایا گیا اور انگریز کے نظام حکومت واقتدار اور فوجی قوت سے مجاہدین منصوبہ بندی کے ساتھ معرکہ آراء ہوئے اور میدان کارزار میں اپنی جواں مردی حوصلہ مندی کے غیر معمولی نشانات ثبت کیے، ان میں ضلع مظفر نگر مغربی یوپی کے قصبات، خصوصاً شاملی اور تھانہ بھون کا بہت گہرا مؤثر حصہ رہا تھا۔ مگر شاملی اور تھانہ بھون میں برپا بڑی اور خوں آشام جدوجہد کے متعلق بہت سے سوالات آج تک صحیح علمی جواب اور تحقیق وجستجو کے منتظر ہیں:

یہ تحریک کسی وقتی جذبہ کے اثر سے اچانک رونما ہوئی تھی، یا لمبی منصوبہ بندی کے نتیجہ میں وجود میں آئی تھی، یہ تاریخی جدوجہد بذات خود کسی المیہ سے متاثر تھی، یا اس نے اپنے شمال وجنوب کو متاثر اور انگریز استعمار کے خلاف تیار اور آمادہ پیکار کیا تھا۔

تھانہ بھون شاملی اور ضلع مظفر نگر کی دوسری بستیوں اور قصبات میں مجاہدین (یا انگریزوں کے الفاظ میں باغیوں) نے کہاں کہاں کس طرح مورچے جمائے، کس پامردی اور حوصلہ مندی سے انگریزی فوج کا مقابلہ کیا، کس کس طرح ان کے دانت کھٹے کیے، کس طرح ان کی قوت وشوکت اور فوج کی مہارت واسلحہ بندی کا بھرم توڑا، کہاں کہاں معرکہ آرا ہوئے، کن میدانوں اور گھاٹیوں میں اپنی اصابت وصلابت کے جوہر دکھائے اور ان مردان خدا میں سے کون کون،

میدان جنگ میں شہید ہوئے، کس کس کی گردن اڑائی گئی، کس کس کو پھانسی دی گئی، کون کالے پانی بھیجا گیا، کس کس کے لئے چودہ چودہ سال کی سزاؤں کا اعلان ہوا، جو خوف ناک سزاؤں سے کسی طرح بچ گئے تھے، ان پر کیا گزری، ان کو کیسی کیسی سخت مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔

سینکڑوں بلکہ ہزاروں اشخاص کی جائیدادیں اور مکانات ضبط ہوئے، بے شمار افراد عہد وفا پورا کرنے کے پاداش میں اپنے گھر اور وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے، کس نے کہاں ہجرت کی، کس گوشہ میں جا کر زندگی گزاری، یہ ایک لمبی داستاں ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ یہ سوالات آج تک تشنۂ جستجو ہیں اور ہر وقت اہل علم وذوق اور اصحاب تاریخ سے توجہ چاہتے ہیں۔

تھانہ بھون شاملی اور اس کے نواح کی جدوجہد، ہماری دینی ملی سیاسی تاریخ کا ایک بڑا دل دوز، پرسوز اور خونچکاں باب تھا، جس سے ایمانی غیرت کے بہت سے دھارے پھوٹے، فکر ونظر کی راہوں میں خاص اجالا ہوا، اور ملت کو مستقبل کا سفر طے کرنے کے لئے ایک تحریک اور ایک نیا جوش عمل حاصل ہوا۔ اس تحریک کے ان ہی گہرے اثرات کی وجہ سے ہم اس پر فخر تو کرتے رہے مگر کسی نے اس پر تحقیق وجستجو کی زحمت نہیں فرمائی، اس کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنے اور ان پر مستند دستاویز وماخذ سے روشنی ڈالنے کا، غالباً ارادہ ہی نہیں کیا گیا۔

کس قدر حسرت وافسوس کا مقام ہے کہ آج تک اس تاریخی بلکہ تاریخ ساز واقعہ کی، شایان شان مستند تاریخ قلم بند نہیں ہوئی۔ اگرچہ تذکرۃ الرشید، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (مؤلفہ تقریباً سنہ ۷-۱۹۰۶ء) سے عصر حاضر تک سلسلۂ ولی اللہی، علمائے دیوبند اور برصغیر ہند کی اسلامی ملی، سیاسی تاریخ پر لکھنے والے اکثر اہل قلم اس کا کسی قدر تذکرہ ضرور کرتے رہے ہیں، مگر ان میں سے غالباً کسی ایک کتاب میں بھی، اس کا صحیح منظر وپس منظر اور واقعات کی جامع تصویر پیش نہیں کی گئی۔ چند جزوی ناتمام سی معلومات واطلاعات ہیں جن کا ہر اک اعادہ وتذکرہ کرتا رہتا ہے۔

اسی بے توجہی اور ناواقفیت کا اثر ہے کہ کئی اہل قلم نے معرکۂ شاملی وتھانہ بھون کا بالکل انکار کردیا ہے، وہ اس کو ایک ایسا فرضی یا معمولی قصہ قرار دے دیتے ہیں جس کی بہت سی کڑیاں مفقود اور کئی عنوانات تشنہ تحقیق ہیں۔ حالاں کہ اس میں تاریخ کی خطا نہیں، غلطی ان لوگوں کی ہے جنھوں نے اس کو ناقص معلومات کے زاویہ سے دیکھا اور ان ناقص معلومات کو آخری معتبر ترین اطلاع سمجھا، جس کی وجہ سے صحیح معلومات تک پہنچنے کا ارادہ بلکہ خیال تک نہیں ہوا گویا:

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اس لئے خیال ہوا کہ اس موضوع پر کچھ لکھا اور پیش کیا جائے، جس سے ان تاریخی لمحات اور ان کے عالی مرتبت، عالی فکر، عالی حوصلہ رہنماؤں کے مقاصد طریقۂ کار اور جواں مردی کی ایک جھلک اور کسی قدر مکمل تصویر سامنے آسکے۔ اس سلسلہ کے آغاز کے طور پر آئندہ صفحات میں اس موضوع کی ایک نہایت معتبر تصنیف:

Mutiny in Uttar Pardesh by Athar Abbas (A.A)Rizvi

سے سنہ ۱۸۵۷ء میں ضلع مظفرنگر خصوصاً شاملی وتھانہ بھون اور اس کے آس پاس کے قصبات وغیرہ میں، معرکہ آرائی کی روداد پر مشتمل صفحات کا ترجمہ پیش کیا جارہا ہے، جو اس موقع پر موجود انگریز، سول اور فوجی افسران کی آپس کی خفیہ خط وکتابت اور سرکاری دستاویزات پر مبنی ہے اور اس سلسلہ میں انگریزوں کے نقطۂ نظر اور کارروائیوں کو جاننے کے لئے معتمد ترین دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب ہندوستان کی مرکزی حکومت کے ایک بڑے منصوبہ کے تحت ۱۹۵۷ء میں ۱۸۵۷ء کی سوسالہ یادگار کے موقع پر، سرکاری محافظ خانوں (   ) میں محفوظ انگریزوں کے عہد کی دستاویزات سے خاصی احتیاط سے مرتب کی گئی تھی، جو سنہ ۱۹۶۰ء تک پانچ بڑی جلدوں میں شائع ہوئی تھی۔

زیر نظر مراسلت اور اس معرکہ آرائی سے وابستہ دوسرے انگریز افسران کی تحریروں سے، چند نہایت اہم انکشافات بھی سامنے آرہے ہیں ہیں:

- اصحاب تھانہ بھون کی یہ جدوجہد کسی وقتی حادثہ یا قاضی عبدالرحیم (برادر قاضی عنایت علی خاں تھانوی) کی، سہارنپور میں بلاوجہ پھانسی کی وجہ سے برپا نہیں ہوئی تھی، بلکہ اس کے لئے لمبے عرصہ سے ہر طرح کی منصوبہ بند تیاری چل رہی تھی اور شاملی کی معرکہ آرائی سے تقریباً چار مہینہ پہلے سے، ان لوگوں نے انگریز افسران اور علاقہ میں ان کے متعلقین کا ناطقہ بند کر رکھا تھا، قاضی عبدالرحیم کی پھانسی نے اس میں جلتی پر تیل کا کام کیا اور پورا علاقہ بیک وقت اٹھ کھڑا ہوا۔
- اس تحریک کے متعدد رہنماؤں کے دہلی کے مجاہدین اور دربار دہلی سے براہ راست روابط تھے اور اس سلسلہ میں اتفاق اور صلاح ومشورہ قائم تھا۔
- سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس تحریک کا دائرہ دہلی میں جمنا کے شمالی کنارہ سے، ہمالیہ کے آخری میدانی علاقہ (تقریباً تین سو کلو میٹر) تک پھیلا ہوا تھا۔ باغپت بڑوت کی شاہ مل کی سربراہی میں برپا عظیم جدوجہد اور نواب محمود خاں بجنور (جو سر سید احمد کی سرکشی بجنور کا

ممتاز ترین عنوان ہیں) کی جنگ حریت بھی، اسی تحریک کا ایک حصہ تھی، جس کی آواز تھانہ بھون سے بلند ہوئی تھی۔ انگریز افسران نے صاف لکھا ہے کہ باغپت بڑوت میں (انگریزوں کے ایک بہت بڑے مخالف اور فوجی قائد) شاہ مل کو اور بجنور میں نواب محمود خاں کو اس تحریک میں شرکت اور انگریزوں کے خلاف مسلح ہو کر میدان میں آنے کے لئے، رہنمایان تحریک تھانہ بھون نے تیار کیا تھا۔

اسی ایک اطلاع اور تصدیق سے جنگ شاملی و تھانہ بھون کی سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگی جدوجہد کی تاریخ کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ انگریز افسران کی یہ اطلاع اور تصدیق بعد کی اطلاعات سے کہیں زیادہ معتبر اور ذاتی مشاہدہ اور تحقیقات پر مشتمل ہے:

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

● اس مراسلت کا صرف یہی ایک پہلو نہیں ہے کہ وہ انگریزوں کے فوجی اقدامات، بے دردی، خوں آشامی اور اس تحریک کو کچلنے کے لئے سب کچھ کرنے کے لئے تیار، افسران کے دلی جذبات اور ارادوں فیصلوں کی تصویر پیش کر رہی ہے، بلکہ اس سے میدان میں معرکہ آرا مجاہدین اور ان کی قیادت و لیڈر شپ کے چند عمدہ پہلو، ان کی جنگی حکمت عملی اور اپنے بڑے مقصد کے لئے منصوبہ بند طویل تیاریوں اور اس لمبی جدوجہد کے کئی ایسے نشانات بھی سامنے آتے ہیں، جو بعد والوں کے لئے چراغ راہ ثابت ہوئے:

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

● ظاہر ہے کہ مجاہدین اور علمائے کرام اور ان کے سرپرست اور اعلیٰ کمانڈر قاضی عنایت علی خاں نے انگریزوں کو چھٹی کا دودھ دلا دیا تھا اور اپنی کامیاب جنگی اقدامات سے نہایت پریشانی میں ڈال دیا تھا، اس لئے انگریز افسران ان کے متعلق جس قدر بھی خراب رائے رکھتے اور جو بھی لکھتے غیر متوقع نہیں تھا، مگر اس کے باوجود، انگریز افسران کی تحریروں کے بین السطور میں ان حضرات کی اعلیٰ منصوبہ بندی، طاقتور و پر پیچ جوابی کاروائی، اعلیٰ جنگی حکمت عملی کا اعتراف صاف نظر آ رہا ہے اور درحقیقت کمال وہی ہے جس کا ایسا ظالم اور بد طینت دشمن بھی اعتراف کرنے پر مجبور ہو۔

● مگر اس سے یہ سمجھ لینا صحیح نہ ہوگا کہ انگریزوں کی یہ مراسلت اور خود نوشت روداد خصوصاً معرکہ شاملی و تھانہ بھون اور اس کے قائدین و رہنماؤں کی حرب و ضرب کی قوت، سپہ سالاری کی

لیاقت وصلاحیت کا پورا تذکرہ کررہی ہے۔ انگریزوں کے خطوط اور تحریرات میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی پسپائی اور ناکامی کا کم سے کم اظہار اور حقیقت واقعہ کی ہلکی سے ہلکی تصویر ہے۔ اصل واقعات اور جنگ ومعرکہ آرائی کی روداد شاید اس سے سوگنا زیادہ، یا اس سے بھی بڑھ کر رہی ہوگی۔

اس موضوع پر انشاء اللہ تعالیٰ مرتب احوال وآثار کی ایک تالیف کی عن قریب تکمیل واشاعت متوقع ہے، امید ہے کہ اس سے اس قول کی تصدیق ہوگی اور اس واقعہ کی بڑی تاریخی ملی حیثیت، اس کے شرکاء، شہداء اور مختلف پہلوؤں کا پہلی بار مفصل مستند احوال سامنے آئے گا۔

مدیر احوال وآثار نے یہ ترجمہ ماسٹر نور محمد صاحب مرحوم (اسارا ضلع باغپت) سے کرایا تھا، جو مرحوم نے تقریباً قلم برداشتہ کردیا تھا، اشاعت کے وقت اس پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی، اس کے لئے اپنے کرم فرما ڈاکٹر جلیل احمد صاحب منگلوری (علی گڈھ، حال کاندھلہ) کو زحمت دی۔ موصوف نے اس کا اصل سے حرفاً حرفاً مقابلہ کیا، ضروری اضافے اور ترمیمات کیں، جس کی وجہ سے توقع ہے کہ اب یہ مکمل ومعتبر ترجمہ ہوگیا ہے، جو ڈاکٹر جلیل احمد صاحب کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ تاہم اگر ماسٹر نور محمد صاحب کا یہ ترجمہ موجود نہ ہوتا تو نئے سرے سے ترجمہ کرنا خاصا دشوار کام تھا۔ فرحمه الله تعالیٰ

والله ولی التوفیق
نور الحسن راشد کاندھلوی

یوپی میں [سنہ ۱۸۵۷ء میں] آزادی کی جدوجہد

تالیف

جناب اطہر عباس صاحب رضوی

[Mutiny in Uttar Pardesh by Athar Abbasi (A.A) Rizvi]

کے چند صفحات

اردو ترجمہ
نور محمد صاحب مرحوم
[اسارا، ضلع باغپت]

نظر ثانی و تکمیل
ڈاکٹر جلیل احمد صاحب منگلوری
[علی گڈھ، کاندھلہ]

اقتباس بیان (R.M.Edwards) مجسٹریٹ مظفر نگر مورخہ ۱۶؍ نومبر ۱۸۵۸ء (۱)

(آخر اگست ۱۸۵۷ء) ابھی دوبارہ گڑبڑ کا آغاز ہوگیا ہے، مجھے اس سلسلہ میں یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ شاہی سفراء کے ذریعہ وہ اس بات پر رضامند ہو گئے ہیں کہ اپنی ذاتی اور باہمی خانہ جنگی بند کردیں اور اپنی پوری قوت کو گورنمنٹ کے خلاف استعمال کریں اور آپس میں ایک دوسرے پر حملہ آور نہ ہوں، سرکاری مالیت جس میں خاطر خواہ اضافہ ہو رہا تھا اچانک خرابی میں پڑ گئی، لوگوں نے اس کی مخالفت شروع کردی اور جو لوگ گاؤں میں اس کی وصولیابی کے لئے بھیجے گئے، ان کے ہتھیار اور گھوڑے ضبط کر لئے اور کسی کسی جگہ ان کو مجروح بھی کیا گیا، یہ واقعات اتنے فاصلہ پر ہوئے کہ میں خود وہاں نہیں پہونچنے پایا کہ ان کو سزا دیتا، کیونکہ میرے اُدھے گورکھا سپاہی سرکاری خزانہ کو لیکر میرٹھ روانہ ہوگئے تھے۔

(۱) اصل کتاب میں اسی طرح ہے مگر یہ غالباً صحیح نہیں ہے بہ ظاہر ستمبر ۱۸۵۷ء ہونا چاہئے۔ (نور)

تھانہ بھون میں محمدی پرچم

چونکہ تشدد پسند لوگ چاروں طرف پھیل گئے ہیں اور شریعت کے مطابق جہاد کا فتویٰ جاری کردیا گیا ہے، جس کی رو سے اس فرض کی ادائیگی سب مسلمانوں پر لازم قرار دی گئی ہے، اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کے لوگوں نے اپنے گھروں میں محمدی علم اعلانیہ لہرادیا ہے، اسی دن مجاہدین نے کافروں کی دوگاڑیاں اور اسلحہ قبضہ میں کرلیا اور ایک سکھ سپاہی کو مار ڈالا۔

انہوں نے تحصیل اور تھانہ کو بند کردیا انتظامی طاقت کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور شریعت کے مطابق نظام چلانے کا اعلان کردیا۔ اس کے نتیجہ میں مختلف گاؤں اور علاقوں سے مجاہدین یہاں جمع ہو گئے ہیں، اس خوف سے کہ کہیں کافروں کی جان ومال کو خطرہ ہو، ان کی حفاظت کے دو طریقہ اختیار کئے جائیں گے۔

شریعت کے نظام نافذ کرنے کی صورت میں تمام گاؤں اور قصبہ والوں کو اس بات کا عہد کرنا ہے کہ وہ اپنے آپ کو برٹش گورنمنٹ کے زیر انتظام نہ سمجھیں، سلطان کی رعایا تصور کریں، عوام اپنی وفاداری کے لئے دلوں کو صاف کریں، تاکہ ان اضلاع سے مکمل طریقہ سے انگریزوں کا صفایا کردیں اور جہاں کہیں کوئی انگریز ملے اس کو قتل کردیا جائے اور اگر کوئی رئیس کسی وجہ سے خوف زدہ ہو، اس کو سمجھائیں اور جہاد کی ترغیب دیں اور امداد کریں۔ اب ہمارے لوگوں کو چاہئے کہ معتبر خبریں پہنچائیں، اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو ایسی صورت میں ان کو اسلحہ دیا جائے۔ [P.128]

باغیوں نے تھانہ بھون خالی کیا

(W. Muir's) کا قلعہ آگرہ سے خط، مورخہ ۵ر اکتوبر ۱۸۵۷ء

فوجی دستے جو مظفر نگر بھیجے گئے تھے، انہوں نے پایا کہ باغیوں نے تھانہ بھون خالی کردیا ہے اور بتایا گیا کہ وہ لوگ شاملی اور بڑوت کی طرف چلے گئے ہیں، ہماری افواج ان کے تعاقب میں ہیں اور میرٹھ ضلع میں اس بات کے بھی انتظامات کئے جارہے ہیں کہ ان کی پیش قدمی کو روکا جائے، کیونکہ اس

کا خطرہ ہے کہ وہ لوگ وہاں جا کر ادھر ادھر چھپ جائیں گے اور قانون کی گرفت میں آسانی سے نہ آ جائیں گے۔ [P.128]

..........مجھے اس امر کا پورا یقین ہے کہ اسپیشل کمشنر ولسن (Wilson) نے میرٹھ کی فورس جو کہ میجر سوائر Major Sawyer کی قیادت میں اس ضلع میں کام کر رہی تھی اس کی مکمل کارگزاری آپ کو فراہم کردی ہوگی، اس لئے میں آپ کی مختصراً ان کا تجزیہ پیش کروں گا، کیونکہ اس سے پہلے تفصیلی معلومات آپ کو ہو چکی ہوں گی۔ [P.128]

مظفر نگر میں بغاوت کے بعد کے واقعات

(R.M.Edwards) قائم مقام مجسٹریٹ مظفر نگر کا خط نمبر 7 کمشنر میرٹھ (F.Williams) کے نام۔

کیمپ تھانہ بھون مورخہ ۱۱ر اکتوبر سنہ ۱۸۵۷ء

مجھے اطلاع دینے کا اعزاز ہے ان واقعات کے سلسلہ میں جو ماقبل ضلع میں ہو چکے اور جس کی اطلاع میں نے اپنے نیم سرکاری خطوط میں دی تھی۔ مجھے اس امر کا پورا یقین ہے کہ اسپیشل کمشنر ولسن (Mr. Wilson) نے جو (Major Sawyer) کے تحت کام کر سکیں، آپ کو میرٹھ کے سلسلہ میں اطلاع دیدی ہوگی، اب میں صرف آپ کو مختصراً ان کا تجزیہ پیش کروں گا، کیونکہ اس سے پہلے تفصیلی معلومات آپ کو ہو چکی ہوں گی۔ [P.128]

خیراتی خاں کی گرفتاری کی کوشش

۲ر ستمبر کو جوائنٹ مجسٹریٹ گرانٹ (Mr Grant) تیسری کیولری کی (ٹکڑی) کے ساتھ، جس کی قیادت کیپٹن کیلورے Captain Galloway کر رہے تھے، کولے کرشاملی سے خیراتی خاں پنڈاری کی گرفتاری کے لئے پراسولی کی جانب روانہ ہوئے۔ خیراتی خاں پراسولی کا بڑا زمیندار اور با اثر آدمی ہے۔

خیراتی خاں کے بارے میں اطلاع ہے کہ وہ بادشاہ کے پاس فوجی امداد حاصل کرنے کے لئے دہلی گیا تھا مگر وہاں سے ناکامیاب واپس آیا۔

گویہ اطلاع خیراتی خاں کے دشمن کے ذریعہ حاصل ہوئی ہے مگر اس پر کلی یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے یہ بھی اطلاع پہونچائی ہے کہ لگان تیار ہے اور تحصیلدار اپنا آدمی بھیج کر وصول کرا سکتے ہیں، اس بات کی سچائی میں اس سے شبہہ ہوتا ہے کہ اس سے قبل تحصیلدار مع تحصیل وتھانہ کے عملہ کے وہاں سے ناکام واپس آ چکے ہیں۔

خیراتی خان کی فوجوں کا قلعہ بڈھانہ پر قبضہ

حکومت کے خلاف کامیابی کے نتیجہ میں جس کی توقع تھی، قریبی پرگنوں میں کھلبلی مچ گئی اور جولہ کے لوگ پرسولی والوں کے ساتھ مل گئے اور بڑوت اور بجرول ضلع میرٹھ بھی اسی سے متاثر ہوا، اور یہ لوگ بڈھانہ پہونچ گئے، جہاں انہوں نے پولیس کو بھگا دیا اور قلعہ پر قبضہ کرلیا۔

میں ان باغیوں کے خلاف حرکت کے لئے بیتاب تھا، کیونکہ روزانہ تاخیر ان کا حوصلہ اور طاقت بڑھا رہی تھی اور نقصان دہ ثابت ہو رہی تھی، لیکن چونکہ گورکھا فوج کا دستہ جو میرے پاس تھا، اس میں سے آدھے سے زیادہ خزانہ کے ساتھ میرٹھ کی جانب روانہ ہو چکا تھا، اس لئے ان کی آمد سے قبل التوا میں ہے، شاملی پر حملہ کرنے کی غرض سے پنجاب رجمنٹ کے سبھی آدمیوں کو واپس بلا لیا گیا ہے۔ مسٹر پامر Palmer اور میجر کے ۲۵ رگردپس (Troops) اور تحصیلدار میراپور سے منسلک دستہ کے ساتھ فوراً شاملی کی طرف روانہ ہو گیا اور اپنے ساتھ میرٹھ سے آئی پارٹی کی بھاری گن لے لیں اور براہ راست میراپور سے شاملی کا رخ کیا۔

میرا ارادہ وخواہش تھی کہ میں بڈھانہ جاؤں اور ان لوگوں کو سزا دوں جنھوں نے بڈھانہ پر قبضہ کرلیا اور حکومت کو بدل دیا اور ایسا ہی جولہ اور پرسولی گاؤں والوں کے ساتھ کیا جائے، لیکن میرا مقصد گرائس (Mr Grant's) کے خطوط کے آنے سے متاثر ہوا، کیونکہ میں شاملی کو کھو دینے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا ہے۔

شاملی پہونچنے پر جاٹوں کے اجتماعات کی خبریں لگاتار ملتی رہیں اور بلاشبہہ کہا جا سکتا ہے کہ خیراتی خاں اپنے ہمراہی بختا اور جگا باشندہ بجرول، حملہ کی غرض سے ایک فورس کے ساتھ روانہ ہوئے، انہیں گوجروں میں غیر متوقع مشکلات پیش آئیں، جو اپنے دیہات میں مقابلہ کے لئے آئے، اس وجہ سے اور یہ معلوم ہونے پر کہ ہماری فوجی طاقت مضبوط ہوگئی، وہ جولہ واپس آنے پر مجبور ہو گئے۔

اس بات میں تلخ تجربہ ہورہا ہے کہ جو اطلاعات حرکات کے سلسلہ میں ملتی ہیں، ان میں (ہمارے آدمیوں اور تھانہ بھون وشاملی سے تحصیل دار کی رپورٹ) بڑا اختلاف ہوتا ہے اور شاملی کے بارے میں متضاد ہوتی ہیں۔ مجھے جلد ہی یہ اطلاع ملی ہے کہ باغیوں کی ایک جماعت کسی گاؤں میں اکٹھی ہوئی ہیں، میں نے ان کو منتشر کرنے کی تنظیم کی، پھر فوراً ہی معلوم ہوا کہ اس سے کثیر تعداد میں دوسری سمت (Direction) میں اکٹھا ہوگئے۔

حملہ کا منصوبہ ترک ہوا

مجھے یقین ہے کہ بہت سے مواضعات میں اس بات پر اجتماع ہوا کہ ایک ہی وقت قبضہ کا ارتکاب جرم کیا جائے، لیکن وقتی طور پر خیراتی خاں وساتھیوں کے پسپا ہونے کی وجہ سے یہ ارادہ ترک ہوگیا۔

شاملی کی اپنی پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر میں نے راؤ گرساکن ھڑھر (Hurhur Presently Harad) کو جو تھانہ بھون کے قریب میں واقع ہے، سزا دینا تجویز کیا۔ اس گاؤں کے لوگوں نے بدنظمی شروع ہوتے ہی ان لوگوں کے ساتھ جو گاؤں کے قریب سے گزرتے، جھگڑا کرنا لوٹنا اور قتل وغارت کرنا شروع کردیا اور راہ کو مکمل طریقہ سے بند کردیا ہے۔ ہم نے ان لوگوں کا مقابلہ آسانی سے کیا اور ان کے قبضہ سے جملہ اسلحہ آسانی سے حاصل کرلیا اور ان کے مویشی بھگا دئے گئے۔ [P.132]

میں اس بات کا بے حد خواہشمند تھا کہ گینداز میندار کو، جو ان جرائم کا سردار تھا گرفتار کروں، لیکن ایسا کرنے میں ناکام رہا۔ مسروقہ اور چھینی ہوئی بہت سی املاک مشتملہ، چینی، گوند، رنگ عمارتی لکڑی، پچیس گاڑیاں بوجھ سے لدی برآمدی ہوئی۔ جو بھوانی ضلع رہتک کے فرم (Firms) سے متعلق تھیں، جو اس وقت لوٹی گئیں، جب وہ شاملی کے لئے اس گاؤں سے گزر رہے تھے، اس مال کو شاملی لایا گیا اور ایک زمیندار کو گرفتار کرلیا اور ضمانت پر رہا کردیا گیا، تا کہ وہ بقیہ سامان جو گاڑیوں کی قلت کے سبب چھوڑا تھا، لاکر پہونچائے۔ اس گاؤں کو آگ نہیں لگائی گئی۔

---

(۱) Hur-hur یہ گاؤں تھانہ بھون سے قریب ۳ میل جنوب میں واقع ہے اور شاملی سڑک کرشنی ندی کے کنارے ہے۔
نوٹ: اس کو آج کل ہڑڑ کہتے ہیں۔

عبدالرحیم خاں کو سہارنپور میں پھانسی

جب فوج واپس ہونے والی تھی ایک آدمی تھانہ بھون سے آیا، وہاں مسلم بغاوت کی اطلاع دی، جس کی سرپرستی عنایت علی خاں کرتے تھے جو قاضی محبوب علی کا بھتیجہ اور عبدالرحیم کا بھائی تھا، جس کو سہارنپور میں پھانسی دی گئی تھی (ذریعہ مسٹر اسپانکی Mr.Spankie) چونکہ ہمارے آدمی ۱۲ رگھنٹہ سے باہر تھے، آرام اور کھانے کی ان کو ضرورت تھی، ان کو شاملی لوٹنے کی صلاح دی گئی، بجائے تھانہ بھون پہونچنے کے۔ یہ تحصیلدار صاحب کے مشورے کے خلاف کیا گیا، یہ خوش قسمتی کی بات ہے، اگر ایسا نہ کیا جاتا تو بھاری نقصان ہونے کے امکانات تھے، کیونکہ یہ لوگ بے حد تھکے ماندہ تھے اور یقیناً قصبہ میں داخل ہونے میں ناکام رہتے، جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا کہ ہمارا شاملی کیمپ بھی جاتا رہتا، کیونکہ وہاں ناکافی سپاہی تھے۔ [P/133]

برٹش فوج کی بڈھانہ قلعہ کو حاصل کرنے کی دوبارہ کوشش

چونکہ ہمارے چاروں طرف افواہیں پھیل رہی تھیں اور معاملات ہر لمحہ سنگین ہوتے جارہے تھے۔

میں نے ایک خط لیفٹننٹ کرنل ڈیوس (Lt.Cornel Davis) کو لکھا جس کے شہسوار دستے اس وقت ضلع سے گزر رہے تھے اور درخواست کی کہ اپنی دو گن مشین اور کچھ آدمی مظفرنگر سے بڈھانہ بھیج دے اور خیراتی خاں سے قلعہ کو خالی کرانے کی کوشش کرے، تاکہ ہماری پولیس وہاں دوبارہ قبضہ حاصل کرسکے اور بعدازاں جولہ کو برباد کیا جائے، جو خیراتی خاں کے ساتھ ہے اور ٹروپ کا یہ حصہ نگوہ گھاٹ کو عبور کر، اصل ٹروپ کے محض ایک دن بعد میرٹھ پہونچے گا۔ [P/133]

جھنجھانہ سے سرکاری سوار اور چپراسیوں کا انخلا

موصولہ اطلاعات کے مطابق ۱۲ رتاریخ کو جو سوار اور چپراسی مالگزاری وصول کرنے پرگنہ جھنجھانہ میں تھے، سب کو بھگا دیا گیا اور اسی طرح پرگنہ کاندھلہ کے مواضعات میں جو کام کررہے تھے، ان کو لوٹ لیا گیا، وہ صرف اپنی جان بدقت بچاسکے۔ ہنڈن ندی کے پار مغرب کی جانب، پرگنہ بڈھانہ، شکارپور، بگھرہ، اور

(۱) شکارپور، تحصیل بڈھانہ میں پرگنہ ہے، جو پرگنہ کا صدر مقام ہے، یہ پرانا قصبہ ہے، لیکن فی الوقت بہت خراب حالت میں ہے۔ یہ ہینڈن ندی کے کنارے ہے اور بڈھانہ سے ۶ رمیل کا فاصلہ ہے، چرتھاول پرگنہ کا صدر مقام ہے اور مظفرنگر کا شمالی حصہ ہے، جو تھانہ بھون کے قریب ہے۔

چرتھاول اور پورا پرگنہ تھانہ بھون اور شاملی وکاندھلہ کے جملہ جاٹ مواضعات میں جمنا تک و جھنجھانہ کے کچھ حصہ میں ابتری پھیل گئی ہے، بلوائیوں کے گروہ جا بجا اکٹھے ہور ہے ہیں۔

جولہ اور پرسولی میں جاٹوں کا مجمع

تھانہ بھون اور شاملی کے تحصیلدار کی رائے کے مطابق، سب سے زیادہ فتنہ وخطرہ جاٹوں کی جانب سے ہوگا، قاضی اور اس کے آدمی چار پانچ دن تک حرکت نہ کریں گے، بلکہ اس عرصہ میں تیاری کریں گے، اس حصہ ارضی پر ان لوگوں کی معلومات ہم سے زیادہ ہے، کیونکہ میرا یہاں آنے کا پہلا موقع ہے، ان کے ذرائع ابلاغ ہم سے اچھے ہیں۔ جاٹ اس معاملہ میں پیش پیش ہیں اور جولہ و پرسولی بلاشک ان کا خاص مرکز ہے، اس لئے مناسب ہے کہ اس جگہ سخت اقدام کئے جائیں اور واپسی پھر شاملی، اور اس طرح غالباً ہماری مشکلات ختم ہوجائیں گی۔ اب ہم بڈھانہ کی حکومت کو بدل سکیں گے اور اس طرح تھانہ بھون اور شاملی پر کنٹرول کیا جاسکے گا، اور اس طرح کرنال اور میرٹھ کا براہ راست رابطہ قائم ہوجائے گا، جس کے لئے آپ نے مجھ کو ہدایت کی ہے، ایسی حرکت عمل میں لانے کا پختہ عزم کیا گیا ہے۔

لیفٹنٹ کائلر (Lieutenant Cuyler) کی سخت بیماری کی وجہ سے، ہماری روانگی ۱۳ر تاریخ کے بجائے ۱۴ کو قبل صبح کے وقت ہوئی، ہمارا ارادہ تھا کہ ہم براہ راست بڈھانہ پہنچیں اور قلعہ پر قبضہ کریں، جس کی ۱۵۰ آدمی حفاظت کررہے تھے، سامان وہاں چھوڑ جبکہ سپاہی کھانے سے فارغ ہوجائیں، جولہ اور پرسولی روانہ ہوں، ہمارے اس منصوبہ میں خلل پیدا ہوا، جب کہ ہمارے آدمیوں پر مذکورہ مقامات کے لوگوں نے حملہ کیا، ان کو فوراً شدید نقصان کے ساتھ بھگایا گیا۔ ہلاک شدہ لوگوں کی تعداد ۲۰۰ کے قریب ہے، اس لڑائی میں اتنا وقت لگ گیا کہ ہم نے فوراً بڈھانہ روانہ ہونا مناسب سمجھا، کیونکہ وہاں قلعہ میں موجود لوگوں سے شدید مزاحمت کا اندیشہ تھا۔

قلعہ بڈھانہ کو خالی کرایا گیا

یہ قلعہ جو کافی وسیع اور مضبوط ہے اس کو ہمارے پہنچنے پر خالی کرایا گیا، لیکن دروازہ بند ہونے کی وجہ سے اندر داخل ہونے میں دیر ہوئی، جن کو مسٹر پامر (Palmer) نے بھاری گنوں (Mountain Train Guns) سے

اڑادیا۔ تمام جماعت تھک گئی تھی اور سورج کی گرمی سے پریشان تھی۔ ہم اپنے کیمپ پر شام چار بجکر بیس منٹ تک پہونچ پائے

تحصیل شاملی پر حملہ

رات میں مجھے شاملی کے زمیندار مہر سنگھ کی ایک عرضی ملی، جس میں تحریر تھا کہ شاملی تحصیل پر حملہ ہوا، لیکن اس کی کوئی اطلاع تھانہ یا تحصیل کے آدمیوں کے ذریعہ نہیں ملی، ۱۵ر کی صبح کو مجھے ملہیڑہ (Mulherah) سے لیفٹننٹ فریزر کے ہنڈن پر (Lieutenant Fraser) دو شہسوار بندوقچیوں اور ۱۰۰ر سکھوں کے ساتھ ہونے کی اطلاع ملی، یہ پہلی اطلاع تھی جو مجھے کمک بھیجے جانے کے سلسلہ میں ملی۔

لیفٹننٹ فریزر (Lieutenant Fraser) معہ اپنے ہمراہیوں کے ۷ر بجے شام کو پہنچے اور اسی رات کو شاملی کی جانب روانہ ہوگئے۔ ابھی تک کوئی اطلاع شاملی کے بارے میں نہیں ملی، شاملی پہونچ کر قتل وخون کی پوری داستان کا پتہ چلا۔ یہاں تک ہوا کہ جو لوگ بچ گئے وہ بھی اس درجہ خائف تھے کہ اطلاع دینے سے گھبراتے تھے، ذیل میں مجروحین ومقتولین کی فہرست درج ہے، جو شاملی میں ہوئے اور میری روانگی سے قبل دونوں تحصیلداروں نے یقین دہانی کرائی کہ ہم بہ آسانی آنے والوں کا مقابلہ کرسکتے ہیں اور جو لوگ یہاں بغرض حفاظت چھوڑے گئے، وہ اس کے لئے کامیاب ثابت ہوں گے اور ہر حملہ کا مقابلہ کر پائیں گے۔

تحصیل دار ابراہیم خاں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، مجھے بڑا افسوس ہے کہ اس انعام سے محروم رہ گیا جس کا وہ مستحق تھا، لیکن اگر اس نے پنجاب رجمنٹ کے اشاروں پر کام کیا ہوتا تو اس کا نتیجہ اس کے برعکس ثابت ہوتا۔ ابراہیم خاں کا کنبہ بغیر کسی ساز وسامان کے رہ گیا ہے، میں اس لئے حکومت سے درخواست کروں گا کہ اس کی وفاداری کی وجہ سے اس کے لڑکے کو قاضی کی جاگیر عطا کی جائے، جو کہ قاضی کی بغاوت کے جرم میں ضبط ہوئی ہے، تاکہ عوام میں یہ جذبہ پیدا ہو کہ وفاداری کرنے والوں کو ان کی خدمات کے عوض نوازا جاتا ہے۔ بلاشبہہ یہ انعام بہت اثر انداز ہوگا اور ایسا کیا جانا گورنر جنرل کے اعلان کے عین مطابق ہوگا۔

میرے خیال سے یہ بھی مناسب ہے کہ باغیوں سے حاصل شدہ کچھ زمین بختاور سنگھ تحصیل دار تھانہ بھون کے خاندان کو بخشی جائے، اور اسی طرح بھوانی سہائے تھانیدار شاملی کے عیال اور اسی طرح ان لوگوں کو

بھی فراموش نہ کیا جائے جو زخمی ہوئے ہیں یا مارے گئے ہیں۔ میں آپ کے حکم کا منتظر رہوں گا کہ آیا کچھ معاوضہ ان کو بھی دیا جائے، جن کے گھوڑے اور مالیات ضائع ہوئی ہیں۔

میں اس کے ساتھ ہی آپ کے علم میں صندل خاں کا کردار بھی لانا پسند کروں گا، اس نے اور اس کے ہمراہیوں نے سب کام بڑی اچھی طرح انجام دئے۔ ان سے پہلے محمدی جھنڈا لہرایا گیا تھا، دس آدمی ہلاک ہوئے اور ایک لاپتہ ہے اور یہ سب پنجاب رجمنٹ سے متعلق ہیں۔ صندل خاں نے جھنڈا بردار کو مار گرایا تھا، جب کہ وہ اس کا ہم مذہب بھی تھا۔ [P.137]

مظفر نگر کی دھمکی

میرا ارادہ تھا کہ میں فوراً تھانہ بھون پہونچوں اور باغیوں پر حملہ کروں، لیکن مسٹر گرانٹ (Mr Grant) کے مسلسل خطوط آنے پر کہ مظفر نگر کو دھمکی دی جارہی ہے اور یہ کہ **مظفر نگر کی بھاری جماعت قاضی کی جماعت میں شامل ہوگئی ہے،** اس لئے میرا ارادہ واپسی کا ہوگیا، اور ایسا کرنے کی صورت میں باغی ضرور وہاں پہونچیں گے اور صدر اسٹیشن پر حملہ کریں گے اور اگر ہم اس طرح مظفر نگر سے تھانہ بھون جائیں تو صدر مقام محفوظ رہے گا۔

سہارنپور اور میرٹھ سے کمک آنے پر باغی قصبات کا رخ کیا گیا لیکن آپ کو پہلے ہی اپنے نیم سرکاری خطوط کے ذریعہ کہا جاچکا ہے کہ میں نے ملٹری افسران کو شدید مزاحمت کا اندیشہ بتا کر اپنی قوت کا جائزہ لینے کو کہا ہے کپتان اسمتھ (Captain Smith) نے حملہ کا پورا عزم کرلیا ہے، اس وجہ سے ہم اپنے ارادہ میں ناکام رہے، **جب ہم ان جگہوں پر پہونچے تو ہم نے بہت بھاری تعداد باغیوں کی دیکھی، جو باغات میں جمع تھے، اور گہری خندقیں کھود رکھی تھیں،** ہمارے توپ خانے نے فائر کھول دئے اور ملٹری نے ان کو منتشر کردیا، بندوقوں نے زیادہ کام باغات اور درختوں کی وجہ سے نہیں کیا۔ [P/137-138]

لیفٹننٹ جونس ٹن (Lieutenant Johnstone) کا زخمی ہونا

دوسری بار کچھ گورکھا اور سکھ لوگوں کو کھیتی کی صفائی کے لئے بھیجا گیا، اس مدت میں مسٹر جونس ٹن جو سکھوں کی سربراہی کررہے تھے، ان کو ایک بندوق کی نال سے زخمی کردیا گیا، جس کے نتیجہ میں وہ واپس لوٹنے پر مجبور ہوگئے۔ کچھ دیر کے بعد یہ معلوم ہونے پر کہ سرکش اپنی گولہ باری بند نہیں کریں گے، ہمارے دستہ بائیں

طرف کو روانہ ہو گئے، اور ایسی جگہ ٹھہر گئے جہاں حالات سازگار تھے، کچھ گولیاں چلانے پر جب خاموشی رہی تو اندازہ لگایا کہ باغی چھپ گئے، تو گولیاں چھوڑنا بند کر دیا گیا۔ [P/138]

مظفرنگر پر سخت اقدام، باغیوں کی سخت مزاحمت

ایک بہادر جمعیت جس میں سکھ اور گورکھا شامل تھے، جن میں پہلے دستے کی کمان کپتان اسمتھ (Captain Smith) اور دوسرے کی کائلر (Cuyler) کر رہے تھے، ان کو ہدایت کی گئی کہ وہ مظفرنگر جائیں اور سخت کاروائی کریں۔ جنہوں نے حسب ہدایت کام کیا اور کچھ عمارات کو جو باغیوں کے قبضہ میں تھیں، اپنے قبضہ میں لے لیا اور دو گن سخت مقابلہ کے بعد ان سے چھین لیں، کیونکہ ان کی باہر سے کوئی امداد نہیں آرہی تھی، اس لئے ہتھیار چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس موقعہ پر ہماری فوجوں نے جو گولیاں داغیں ان کے جواب میں خاموشی رہی، جیسا کہ ملٹری افسران کو پہلے ہی اطلاع دی گئی ہے۔

نئے جوانوں کی جماعت اس معاملہ میں ناقابل ہے، گورکھا اور سکھوں کے یہ نوجوان اس معیار کے ثابت نہیں ہوئے جن کی اتنی تعریف کی جاتی رہی ہے، البتہ افسران قابل اعتماد ہیں اور انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو ان کو کہا گیا، لیکن ان کا تعاون ان کے عملہ نے نہیں کیا، جس کی اہم وجہ یہ رہی کہ ان کی بڑی تعداد کو لڑائی کا تجربہ نہیں تھا۔

کھیڑی (Kheaoree) گاؤں میں مقابلہ

جب ہم واپس آرہے تھے گھوڑ سواروں اور پیدل لوگوں کی ایک بھاری جماعت نے کھیڑی (Kheaoree) گاؤں کے نزدیک حملہ کیا، جن پر پنجاب توپ خانہ کی دو ٹکڑیوں نے جس کی سربراہی میل وائل (SS. Melville) اور M. Low Esq کر رہے تھے مقابلہ کیا۔ اس میں M. Low Esq سخت زخمی ہو گئے، باغی تتر بتر کر دئے گئے اور قریب سو آدمی مار دیئے گئے، بقیہ لوگ کھیتوں میں چھپ کر بھاگ گئے۔ سڑک پر ہمیں پھر کوئی دشواری نہیں ہوئی، آپ کا نیم سرکاری خط جس میں کسی بھی صورت میں تھانہ بھون پر حملہ نہ کرنے کی ہدایت کی تھی، کیونکہ وہاں پر قلیل فوجی دستہ سے حملہ کرنا مناسب نہیں تھے، مجھے ابھی ابھی یہاں واپسی پر ملا۔ اگر آپ کا یہ حکم نامہ اس سے قبل مل گیا ہوتا، تو میں اس سے پیشتر دیئے گئے حکم نامہ پر عمل نہ کرتا، جس میں کہا گیا تھا کہ باغیوں کی فوراً سرکوبی کی جائے، میں نے اس پر عمل کیا، کیونکہ میرے خیال سے

ہماری فوجی طاقت ناکافی تھی مگر اس بات کا اندازہ کرنا فوجی افسران پر تھا، انہوں نے مثبت میں رائے دی ہے، ہم نے سب کچھ کیا لیکن ناکام رہے۔ میں نے واپسی پر آنے کے بعد سے اس پر غور کیا اور شکر کیا کہ ہم کو گلیوں اور سڑکوں میں کارروائی کرنے پڑی، بجائے مخصوص ٹھکانوں کے، یہ جگہ بہت بڑی ہے جس کی وجہ سے میں یقین کرتا تھا کہ ہم طاقت میں کم ہیں، اگر کھلے میں مقابلہ ہوتا تو ہماری فوج کا ستیاناس ہو جاتا۔ [P/139]

باغیوں کا تھانہ بھون سے انخلاء

میجر ساوئرے (Major Sawyer) کی زیر قیادت فورس میرٹھ سے آنے پر، جیسا کہ آپ کو مسٹر ولسن (Mr Wilson) اطلاع دے چکے ہیں، ہم تھانہ بھون کی جانب بڑھے اور سرکشوں سے اس جگہ کو خالی پایا۔ میں چاہتا تھا کہ اس جگہ کو برباد کردوں مگر اس مقام کی وسعت اور بارود کی قلت کے سبب ایسا نہ کر سکا۔

ایک دن فوج نے اس مقام پر قیام کیا، یہ فوج اپنے ساتھ غلہ لئے تھی، اس نے راستہ میں موضع ہڑاور ہینڈ کو برباد کردیا اور یہی حال سنبھال (Sibhal) (ا) کا ہوا۔ یہاں کے لوگ شاملی کی یورش میں سربراہ تھے۔ میجر (Major Sawyer) بہادر کی درخواست پر کہ شاید ہم مخالفوں سے بجرول میں مل سکیں، ہم نے فوجی دستہ کو تقسیم کردیا۔ ہم نے اس دستہ کے ساتھ دیا جو اس گاؤں اور بڑوت کی جانب جارہا تھا اور پھر کاندھلہ میں واپس آئے اور تین دن تک کاندھلہ میں قیام کیا اور بھاری رقم مال گذاری وصول کی۔ [P,140]

مظفر نگر کی موجودہ صورت حال

۳/اور ۴ تاریخ کو (Mss. Tom) کا کیمپ کیرانہ میں لگا، جہاں مزید مال گذاری وصولی ہوئی اور پانچ تاریخ کو جھنجھانہ کے لئے روانہ ہوگئے، جہاں ۵/اور ۶ تاریخ میں فوجی دستہ نے قیام کیا، یہاں بیشتر مسلمانوں سے بالکل خالی پایا، لیکن میں دوسرے باشندوں کو یہاں آنے کی ترغیب نہیں دے سکا اور مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ کوئی بھی شہادت دینے کے لئے حاضر ہونا نہیں چاہتا۔ بہر حال مجھے پوری طرح باغیوں کا علم ہے اور امید کرتا ہوں کہ میں بہت جلد ان کو پکڑلوں گا۔ قصبہ کی چہار دیواری اور اس

(ا) یہ غالباً وہی گاؤں ہے جو راستہ شاملی سے بڑھانہ جارہا ہے، اس پر ایک گاؤں ہے جس کو آج کل سما لکھ کہتے ہیں۔ (نور)

کے آٹھوں دروازوں کو برباد کردیا گیا ہے، لیکن یہ کام بہت طویل مدت کا ہے، بہر حال مجھے امید ہے کہ میں اس کام کو پورا کرنے کے بعد یہاں سے روانہ ہوں گا۔

شیخ زادوں کی واپسی کو روکنے کے لئے اور سرکاری اہل کاروں سے بدلہ لینے کے خیال کو مانع کرنے کی وجہ سے، میں تجویز کرتا ہوں کہ اس جگہ کا انتظام منصور علی خاں اور دوسرے روسائے جلال آباد کو سپرد کردیا جائے، جنہوں نے اس ساری ابتری میں برٹش حکومت کا ساتھ دیا۔

جہاں تک تھانہ بھون کے عوام کا تعلق ہے مجھے اچھی طرح معلوم ہے اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ سب قاضیوں کے بھڑکانے سے تشدد پسند ہوئے، بالخصوص قاضی کے بھتیجے عبد الرحیم خاں کے سہارنپور میں پھانسی دیئے جانے کی وجہ سے، لیکن دہلی کی فتح کے بعد یہاں اس قسم کا کوئی معاملہ پیدا نہ ہوگا، مجھے اس کا کامل یقین ہے اور بادشاہ کے باغی ساتھی یہاں پہونچ جائیں گے۔ [P/141]

شاملی کی املاک کو تباہ نہ کرنا

مسلمانوں کی دہشت گردی جو انہوں نے حکومت کے عملہ کے ساتھ کی اور جس کا بدلہ مسجد میں سب لوگوں کو ذبح کرکے لیا گیا، جہاں یہ لوگ پناہ کے لئے جمع ہوگئے تھے، جس کے نتیجہ میں مسجد کی وہ دیوار خون سے بھر گئی تھی۔ جو مسجد اور شوالہ کے درمیان تھی۔ میں کوئی رائے زنی نہیں کرنا چاہتا کہ شاملی کے عوام کے ساتھ کیا ہوا، کیونکہ ان کے کردار کے بارے میں ابھی تفتیش کی جارہی ہے، اس کی تحقیقی رپورٹ جلد پیش کی جائے گی، کیونکہ میرا پورا وقت مصروفیت میں لگا ہوا ہے(۱)

جولہ اور کرالسی پر حملہ

ایڈورڈس وپال مور (Edwards Palmer) وغیرہ کو چھوڑ کر میں شاملی آیا، انہوں نے کل بڈھانہ کا ارادہ کیا تھا، لیکن سڑک پر گڑبڑ کی وجہ سے ہم نے اتوار سے آج تک کوئی خبر نہیں سنی، لیکن مقامی باشندوں سے معلوم ہوا کہ انہوں نے جولہ اور کرالسی وغیرہ کو آگ لگادی اور اب بڈھانہ پہونچ گئے۔ میں نے گھوڑسواروں کے ایک افسر کے ذریعہ فوراً اطلاع دی کہ وہ کل ملہڑہ (Mulhera) گاؤں میں تھا، جو

(1) Report from R.M Edwards to Commissioner Meerut Datel 11Th. 1857 Deptt. X111 file No19.1857 State Archires of 4.P.

بڈھانہ کے قریب ہے۔اس لئے میں خیال کرتا ہوں کہ وہ اپنے سو سکھ جوانوں کے ساتھ وہاں پہونچ گیا ہوگا اور اس وقت تک ایڈورڈ (Edwards) سے مل چکا ہوگا۔

مجھے یہ تحریر کرتے ہوئے بڑا دکھ ہے کہ مجھے معلوم ہوا کہ تھانہ بھون میں جن لوگوں نے محمدی علم لگایا ہے انہوں نے شاملی کو لوٹ لیا ہے اور ابراہیم خان تحصیل دار کو قتل کر دیا گیا ہے اور تھانہ بھون کے تحصیل دار بختاور سنگھ کو بھی قتل کر دیا گیا اور اس کے ساتھ سب کے سب افسران کو ہلاک کر دیا گیا۔

یہ میرا فرض ہے کہ میں تم کو اس کی اطلاع دوں اگر چہ مجھے اس کا خیال ہے کہ تم کو اس کی اطلاع مل گئی ہوگی۔

خفیہ محکمہ سے معلوم ہوا کہ جلال آباد میں تھانہ بھون کے پیشکار جان بخش خاں کے لڑکے پر، جو کہ جلال آباد کے رئیس کے گھر مقیم تھے پر حملہ کیا جائے گا اور سبز علم کل وہاں لہرایا جائے گا۔

اور اب یقینی طور سے معلوم نہیں کہ ایڈورڈ (Edwards) کہاں ہے، یہاں ہمارے پاس بہت کم فوجی طاقت ہے، صرف ۳۰ گورکھے ہیں، جس میں بیش پنجاب توپ خانہ کے ہیں ۷۰ سکھ سپاہی جو نامکمل تربیت یافتہ ہیں اور مقامی لوگوں کے قول کے مطابق ناقابل اعتماد ہیں۔لفٹنٹ ونڈر (Lieulenant Vander) کی کمان میں، کسی متوقع حملہ کے دفاع کے لئے کل یہاں چھوڑا تھا، اس لئے اگر آپ ہمیں کچھ مدد بھیجیں تو خوشی ہوگی۔

اگر آپ مناسب خیال کریں اور ایڈورڈس (Edwards) کی کل فورس بھیج دیں، تو ہم باغیوں سے نمٹنے کے لئے کافی ہو جائیں گے۔خاص طور پر ان حالات میں جب کہ کچہری، جیل اور تحصیل کے حالات ابتر ہیں۔مناسب مدد جو آپ خیال کریں روانہ کر دیں، تمام فوجی دستے مکمل طریقہ سے لیس ہونا چاہیے، کیونکہ کچہری اور تحصیل کی حفاظت مشکل ہو رہی ہے، کیا آپ کوئی کمک روانہ کریں گے۔

مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اگر یورپین افراد میسر نہ ہوں تو سکھوں کو فوقیت دی جائے، کیونکہ ہرے جھنڈے کی موجودگی میں مسلمان مشتبہ ہو جاتے ہیں، میرا یقین کریں۔بائی سومکھ (By Soomkha) کے بارے میں بہت افواہیں ہیں، وہاں گوجروں کی بھاری جماعت اکٹھا ہو رہی ہے مگر مجھے یہ معلوم نہیں کہ ان کے کیا ارادہ ہیں اور یہ افواہیں کتنی سچ ہیں (۱)

(1) 15-9-1857 Mzn Wtar room Grant To Williams

شاملی کے حملہ کے بعد برٹش کا جائزہ

مجھے آپ کا خط نمبری:۶۶ مورخہ ۱۶ر ستمبر ۱۸۵۷ء موصول ہوا، جس کے ہمراہ مسٹر گرانٹ کے مظفر نگر سے لکھے گئے خط کی ایک نقل تھی۔

مسٹر گرانٹ کی جانب سے مجھے امداد کے لئے کوئی درخواست نہیں ملی۔

لیفٹننٹ کائلر (Lieutenant Cuyler) کا خط مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۸۵۷ء (جو مظفر نگر کے جواب) میں بڈھانہ سے تحریر کیا گیا ملا، جس میں تحریر ہے کہ شاملی پر حملہ کردیا گیا ہے، اور کل بازار میں مقامی لوگوں نے بھی اس کی تصدیق کی۔

شاید یہ بہتر ہوتا کہ مسٹر ایڈروڈس جو شاملی میں تھے وہ دیہات میں جانے کے بجائے شاملی میں قیام کرتے جب تک تھانہ بھون کے معاملات اور حالات معمول پر نہ آجائے، ان معاملات پر نظر رکھنے والے موجود لوگوں کی یہی رائے ہے۔

آپ نے اپنا خط کے پیر گراف نمبر ۳ میں یہ تحریر ہے کہ میں اپنی فوجی طاقت سے (Edwards) کی مدد کرتا اور اس کی مدد کرنے کے لئے پورے ذرائع استعمال کرتا، ضلع کے کمانڈنگ افسر نے بتایا کہ وہ ایک جماعت کے بھیجنے کے قابل نہ تھا، ماضی میں میں نے بغیر کوئی وقت ضائع کئے، مسٹر لو (Mr. Low) کے پچپن پنجاب سپاہیوں کو (Edwards) کے ساتھ شریک ہونے کے لئے پہلے ہی بھیج دیا تھا۔

اب آپ مجھے لکھتے، آپ کو یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ میں آپ کی مدد نہیں کرپاؤں گا، میں یہ خیال کرتا ہوں کہ آپ نے ساری ذمہ داری مظفر نگر کی مجھ پر ڈال دی ہے، ایسے کرنا ہمارے ناکامیابی کا سبب بنئے گا۔

کرنل ڈیوس (Colonel Dawes) اس بات کے لئے مجبور تھے کہ وہ ایڈورڈس کے ساتھ مل کر تھانہ بھون پر حملہ کریں۔ مجھے یقین ہے کہ کرنل ڈیوس میجر جرنل پینی (Magar General Penny) کے حکم کے بغیر ایسا نہیں کرسکتے تھے، میں نے اس کو آپ کی تحریر دکھائی، اس انکار کے نتیجے میں میرٹھ سے نہ آنے سے پہلے دو توپ بھیج دی گئی۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے میجر بیگٹ (Magar Bagot) سے امداد کے لئے کہا جو وہ مہیا نہیں کرسکے، اس کے بعد وہ پچاس آدمی بھیجنے پر رضامند ہوگئے، سولہ تاریخ کو میں نے گاڑیاں تیار کی،

مسٹر بیگٹ (Mr. Bagot) نے اسپتال میں بڑی تعداد کو دیکھ کر آخر طے کیا کہ آدمی وہاں نہ بھیجیں جائیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیگٹ کی پارٹی میں ایک سو چھیاسٹھ سپاہی اور سو دیگر آدمی ہیں، جن کی وجہ سے اور مدد مشکل ہے۔

اب مجھے آپ کے خط سے جس کا جواب لکھ رہا ہوں، یہ معلوم ہوا کہ مسٹر گرانٹ خود اپنے کو خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ میں نے خود ایک فوری مراسلہ (Mr. Melville) کو بھیجا جو منگلور میں ہے، کہ اس افسر کے ساتھ شرکت کریں۔ مجھے کوئی خبر بہم امداد کرنے کے سلسلہ میں نہیں ملی، اگر یہ اطلاع معتبر تھی تو اس نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔ سہارنپور صرف ۳۶ رمیل کے فاصلہ پر ہے، اس پر یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ میں اس کی مدد نہ کرتا اور میں ایسا آپ کے حکم کے بغیر نہیں کرسکتا تھا، میں مدد کرتا، کیونکہ اس نے ۲۷ رمیل کے فاصلہ پر آپ کو اطلاع دی اور مجھے اطلاع قریب میں نہ دیکر غیر ضروری تاخیر کی، ایسا کرنا زیادہ منصفانہ عمل تھا۔

مسٹر ایڈورڈس (Mr. Edwrds) کو اپنی سابقہ امداد، اپنے اسٹنٹ مسٹر لو (Mr. Low) کی قیادت میں بھیج چاہوں۔

آج صبح تک مجھے ایڈورس کے بارے میں کوئی اطلاع ان کے ذریعہ نہیں ملی، اس کے علاوہ کیپٹن ہوج (Captain Hughes) نے مقامی افسر کی ماتحتی میں بیس سپاہی (　　) کی مدد کو بھیجے ملی اور مجھے یہ بھی پتہ ہے نہیں تھا کہ وہ شاملی سے روانہ ہوئے یا نہیں، بلکہ خلاف امید (Mr. Low) کے ذریعہ پتہ چلا کہ وہ ابھی تک اسی جگہ مشغول ہیں۔

آج ۱۸ رتاریخ کی صبح کو ایڈورس کی جانب سے ایک نیم سرکاری خط موصول ہوا کہ وہ کل ۱۷ رستمبر شاملی میں تھے اور تھانہ بھون پر دھاوا بولنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور امداد و تعاون چاہتے ہیں۔ میں نے فوراً ہی ایڈورڈس کا خط مسٹر بیگٹ کو بھیج دیا۔ عوام کی طرف سے امداد کا مطالبہ ہے اور خزانہ اور جیل کی محافظت کم کرنے اور دن کے لئے مزید بھرتی کرنے کے لئے، مجھے اس افسر کی جانب سے کوئی مراسلہ نہیں ملا۔

اسی درمیان لنڈھورا کے راجہ کے چچا پردھان صاحب سنگھ کو جنہوں نے حکومت برطانیہ کی موافقت میں قابل قدر و تعریف کا کام کیا ہے اور وصولیابی و گوجروں کو خاموش کرنے کے سلسلہ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کو حکم دے دیا گیا کہ وہ مسٹر Edwards سے فوراً ۲۰۰ دوسو آدمی یا اس سے زیادہ جو ممکن ہوں، رامپور سے جو شاملی کی سڑک پر واقع ہے اکٹھا کریں، وہ اس کی تعمیل کر کے کل پہونچ گئے ہیں۔

قصہ مختصر کرتے ہوئے تحریر ہے کہ آپ کی ہدایت موصول ہونے سے پہلے ہی پنجاب دستہ کے ۷۵ تلوار بند سپاہی ایڈورڈلس کی مدد کو روانہ کر دئے گئے، اگرچہ وہاں سے کوئی مانگ نہیں آئی تھی۔ جب مجھے آپ کے ذریعہ اطلاع ملی کہ Mr Grant کو امداد کی ضرورت ہے، تو دوسرے ذمہ دار کو مسٹر Mr. Melville کو تیس ٹروپرس کے ساتھ مظفرنگر روانہ کر دیا گیا، جب کہ وہاں سے بھی باضابطہ مدد کی درخواست موصول نہیں ہوئی تھی۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ صاحب سنگھ اسی امداد کے ساتھ اس قابل ہے کہ آگے پیش قدمی کرے، مجھے امید ہے کہ اگرچہ رامپور دور ہے لیکن گوجروں کا سردار ہونے کے سبب، وہاں سے خاطر خواہ قابل قدر تعداد میں تھانہ بھون کے لوگوں سے مقابلہ کرنے کے لئے گوجر دستیاب ہوسکیں گے۔

اب میں مسٹر بیکٹ کے ایک خط کی نقل روانہ کر رہا ہوں، میں آپ کے علم میں یہ بھی لانا چاہتا ہوں کہ مجھے ایڈورڈس اطلاع دینے کے بعد، وہ مظفرنگر کے لئے روانہ ہوگئے، مجھے یہ اطلاع لیفٹنٹ کا ٹکر نے دی۔ [P/145.146]

مظفرنگر میں بجنور کے باغیوں کی دھمکی

مظفرنگر سے تحریر کردہ ایڈورڈس کا مراسلہ مورخہ ۱۶ رنومبر ۱۸۵۷ء بنام اسپنکی مجسٹریٹ سہارنپور اور آپ کے خط نمبری ۳۰۰ مورخہ یکم نومبر جس میں مسٹر ہکس کے پنجاب توپ خانہ سے متعلق تھا کہ وہ صدر مقام ضلع پر ہے، بجائے جوالہ پور کوچ کرنے کے۔ اس کے جواب میں تحریر ہے کہ میں مسٹر ہکس کی اس بات سے متفق ہوں، ضلع مظفرنگر ہی وہ ضلع ہے نہ کہ سہارنپور، جس کو باغیوں نے دھمکی دی ہے، کیونکہ یہ عنایت علی خاں سے جڑا ہے اور غلام محی الدین سابق رسالدار ۸ ویں گروپ (Irregulors) ان کا سربراہ ہے، جو وہ بھی اسی جگہ کا ہے۔ جن کے پاس دوسو پچاس باغی سپاہی ہیں اور ۱۵۰ ٹروپرس ہیں [نواب محمود خاں بجنور] ان کا مقصد یہ ہے کہ وہ تھانہ بھون کے مسلم عوام کے ساتھ [جہاد میں] شرکت کریں اور قرب وجوار میں اثر پیدا کریں۔ نواب کی فوج ان کے ساتھ ہوجائے گی۔

جب تک ان کو منتشر نہ کیا جائے گا، وہ جہاں جائیں گے تباہی پیدا کریں گے۔

کپتان ہکش (Coliain Hughes) نے مجھے اطلاع دی ہے کہ انہوں نے سہارنپور کے کمانڈر کو اس کی اطلاع دی ہے اوران کی ہدایت کے منتظر ہیں۔ بجنور کے یہ باغی دارانگر گھاٹ پر جمع ہیں، اوران کے پاس ۴۵ سے ۵۰ کشتیاں ہیں، اور دارانگر یا وبی گھاٹ سے محض چھ(۶) میل دوران کی طاقت موجود ہے۔ [P/147]

محراب خاں کا منڈاور پہنچنا

محراب خاں باغیوں کے سرکردہ منڈاور سردار پہونچ گئے، جو نانوتہ سے ۳/میل کے فاصلہ پر ہے۔ان کے پاس ایک ہزار آدمی، ۷/توپ۔توپ کی تعداد میں صحیح بھی ہوسکتی ہیں، لیکن جہاں تک افراد کی تعداد کا تعلق ہے وہ بہت کثیر ہے۔ میں نے بارڈ اسمتھ (Baird Smith) کو لکھ دیا ہے کہ وہ یقیناً ہماری فوج پر حملہ کرے گا، کیونکہ اس کو ہماری طاقت میں ڈیوڈس رائفلس اور ہوگس کے چلے جانے سے آئی کمزوری کا علم ہوگیا تھا۔ میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ احمد اللہ ہمارے خلاف لڑے گا یا نہیں۔محراب خاں کے کردار کو اچھی طرح جاننے کی وجہ سے اوراس کے ہمراہی راغب حسین کے کردار کی بنیاد پر، میں حالات کے جائزہ کے بعد کہ حالات بہت نازک ہیں، اس لئے میں اپنی بیوی کے ہمراہ میرٹھ چلا جاؤں۔

باغی یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی کثیر تعداد ہے، اس لئے ہم ہتھیار ڈالدیں گے اور ہمارا ہر سمت سے محاصرہ کردیں گے۔ مجھے کچھ عرصہ تک سہارنپور سے آدمیوں کے ملنے کی کوئی امید نہیں ہے E. Vens کی توپیں ہمارے پاس ہیں، وہ خیال کرتا ہے کہ قلیل تعداد کی وجہ سے وہ کس طرح کام کرسکے گا، Page کو بھی مزید امداد کی ضرورت ہے، افغان بالکل بلا بارود کے ہیں، ان کے پاس نہ کوئی افسر ہے اور نہ جانتے ہیں کہ کس طرح مل کام کریں، اگر ہم واپس ہٹ جاتے ہیں تو کیا ہوگا، ہماری فورس میں صرف ۳۰۰/آدمی ہیں، جن میں دوسو اچھے ہیں، افغان اچھا کام کرسکتے ہیں لیکن بغیر کمانڈر کے کس طرح ممکن ہے قادچورا( ) خوف زدہ ہیں۔کل ہم مناسب طریقہ اختیار کریں گے۔

محراب خاں کا دوآبہ میں داخلہ اور برطانوی افسران میں خوف وہراس

مجھے یہ اطلاع دینی ہے کہ Edward کا مراسلہ ملا، جس کی نقل روانہ کررہا ہوں۔جس سے معلوم ہوتا ہے محراب خاں کی زیر قیادت بھاری تعداد باغیوں کی جمع ہوگئی ہے۔

بظاہر سوانفنٹری اور سوتوپ خانہ والے سپاہیوں کی موجودگی غالباً وہ اپنے اس ارادہ کو ترک کردیں گے۔ میری رائے میں مسٹر ایڈورڈس اگر مقابلہ کریں تو وہ کامیاب ہوں گے اور ہزاروں باغیوں کو کچل دیں گے۔

برٹش کو محراب خاں گے مقابلہ میں فورس کی ضرورت اور اس کی امداد

آج کے آپ کے خط کے جواب میں جواب طلب اموز کے سلسلہ میں تحریر ہے کہ کار بائیں (ہتھیار) والے ایک ٹروپ نے بتایا کہ ۱/۲ اسکھوں کی توپ والی ایک پارٹی دوگن مشین کے ساتھ آج رات کو کھتولی سے مظفرنگر کی جانب مارچ کرے گی، تاکہ مظفرنگر میں زیادہ طاقت پیدا ہوسکے۔ ضلع کے کلکٹر سے درخواست کی جائے کہ وہ برابر اطلاعات فراہم کرتا رہے اور اس جماعت کے وہاں پہونچنے پر امداد کرے۔

کمشنر میرٹھ کا مراسلہ (Edwards) کے نام مورخہ ۷/دسمبر ۱۸۵۷ء

محراب خان کے بارے میں دی گئی اطلاع کے مطابق ،وہ دریا کے دوسری جانب منڈوار پہونچ گئے ہیں، ذیل میں میجر جنرل کی خط وکتابت جو میرٹھ میں کمانڈر کررہے ہیں، درج کرہاہوں۔

مسٹر پامر (Palmer) جو یہاں تھے فوراً کھتولی چلے گئے ہیں، تاکہ فوج کی اس ٹکڑی سے مل سکیں جس نے رات میرٹھ سے آپ کی مدد کے لئے کوچ کیا تھا۔

مظفرنگر کے باغیوں کو سزا

ذیل میں توجہ طلب امر ہے کہ باغیوں کو گرفتار کیا جائے اور ان کے املاک کے ضبط کیا جائے۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ ایسے لوگوں کی فہرست معہ ولدیت قومیت وسکونت تیار کی جائے جو بغاوت میں شامل ہوئے یا برگشتہ ہوئے۔

[آئندہ شمارہ میں ضلع سہارنپور میں تحریک سنہ ۱۸۵۷ء اس کے شہداء اور سزا پانے والوں کا کچھ تذکرہ آئے گا۔ انشاء اللہ]

FREEDOM STRUGGLE IN UTTAR PRADESH

SOURCE-MATERIAL

INFORMATION DEPARTMENT, UTTAR PRADESH
LUCKNOW

دار العلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کا
سب سے پہلا نصاب تعلیم
اس کی معنویت و جامعیت اور دور رس نتائج و ثمرات

نور الحسن راشد کاندھلوی

[مرتب احوال وآثار کا یہ مضمون جو مؤقر مجلہ ماہ نامہ الفرقان لکھنؤ کے جمادی الثانی ۱۴۲۸ھ جولائی ۲۰۰۷ء کے شمارہ میں چھپا تھا، چند تصحیحات و ترمیمات کے بعد، احوال وآثار میں بھی شائع کیا جارہا ہے۔]

برصغیر ہند کے مدارس کا نصاب تعلیم، ایک ہمہ وقت زندہ و تازہ موضوع ہے، جس پر تقریباً ایک سو سال سے بحث و گفتگو جاری ہے، اس کے اچھے برے تمام پہلوؤں کا خاصا وسیع اور گہرا تذکرہ و تجزیہ ہو چکا ہے مگر کیا اس بحث و گفتگو سے اس کی نافعیت اور مردم آفرینی کا جوہر کم ہوا، یا اس کی تنقیح اور تحقیق مزید سے اس کو مفید و مؤثر بنانے کی کوئی تدبیر مثمر و بار آور ہوئی، دونوں کا ایک ہی جواب ہے.........نہیں!

اگر یہ جواب صحیح ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہمارا یہ نصاب تعلیم اب ویسے ذی علم، فہیم اور صاحب فضل و کمال افراد تیار نہیں کررہا جن کی ملت اسلامیہ کو ہمیشہ ضرورت رہی اور ہمیشہ رہے گی۔ اگر یہ نصاب ناقص تھا تو اس سے ایسے ایسے اعلیٰ ترین اور نمونۂ فضل و کمال اصحاب کس طرح پیدا ہوئے، اب اس کا وہ اندرونی جوہر اور مردم گری کا ہنر کہاں چلا گیا، کہ اب اس نصاب تعلیم سے نہ دیوانے وجود میں آرہے ہیں نہ فرزانے! اس کی وجہ کیا ہے، اس کے اسباب کیا ہیں؟

دیانت داری اور گہرائی سے سوچئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زوال و بگاڑ کی وجہ دراصل وہ علاج ہے جسے غلطی سے ذریعہ شفا سمجھا جارہا ہے، جب تک یہ نصاب بڑی حد تک اپنی اس اصل صورت و کیفیت میں رہا، جس کو ہمارے بڑے اسلامی مدارس (دار العلوم اور مظاہر علوم سہارنپور) نے اپنے تعلیمی سفر کے آغاز کے موقع پر مرتب اور نافذ کیا تھا، تو اس کے نتائج نہایت غیر معمولی اور شاندار رہے، اس سے ایسے ایسے افراد وجود میں آئے کہ دنیائے علم کی آب و تاب میں اضافہ ہو گیا اور جب تک تعلیم کے اس منہج اور اس کی خاص طرح کی جامعیت کا خیال رکھا گیا، اس کے دامن سے ملک و ملت کو تر و تازہ نئے نئے پھول اور عمدہ تحفے ہاتھ

آتے رہے اور جیسے ہی اس نصاب تعلیم میں تراش خراش کا عمل شروع ہوا، بعض چیزوں کو فضول اور زائد بلکہ خلاف تقشّف و دین سمجھ کر نکال دیا گیا اور اس نصاب و معمول میں، جو ہزار ہا علماء کرام اور مدرسین عظام کی نسبتوں اور دیدہ ریزی کا مرقع اور صدیوں کے تجربات کا نچوڑ تھا، تبدیلی شروع کی گئی تو یہ ایک نا قابل تردید حقیقت ہے کہ ہر اک تبدیلی کے ساتھ، اس کی صلاحیت مردم آفرینی کی لیاقت میں کمی آتی گئی اور:

''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی''

اس لئے ضرورت ہے کہ ہم ایک مرتبہ پھر اصل کی طرف رجوع کریں، ان مدارس کے سب سے پہلے نصاب تعلیم کا ایک مرتبہ پھر اعادہ اور تجدید کریں، اپنے موجودہ نصابات اور اس قدیم نصاب تعلیم کی افادیت کا ایک مرتبہ اور جائزہ لیں مکرر تجربہ کریں کیوں کہ یہ فراموش کیا گیا نصاب تعلیم جو ان مرکزی علمی اداروں میں، ان کے آغاز کے پہلے سال سے جاری کیا گیا تھا، حیرت انگیز حد تک ایسے مضامین وخصوصیات کا جامع ہے، جن کا عصر حاضر کے مسائل کے پس منظر میں مطالبہ اور تذکرہ کیا جاتا ہے۔

یہ نصاب جو ان مدارس میں نافذ کیا گیا تھا اور جو موجودہ نصاب ہے، اس کے اختلاف وتغیرات کا دونوں کے باہمی مقابلہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، مگر دسیوں ترامیم واصلاحات کے باوجود کہا جاتا ہے کہ یہ وہی نصاب ہے، جو ہمارے مدارس میں ان کے آغاز کے اول دن سے رائج ہے، اور معلوم نہیں کیوں اس نصاب کو درس نظامی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نظامی کی یہ نسبت اگر شہرۂ آفاق مدرسہ نظامیہ بغداد سے ہے تو کس وجہ سے اور اگر خاندان علمائے فرنگی محلی کے جد امجد، حضرت مولانا ملا نظام الدین سہالوی (وفات ۹ جمادی الاولیٰ ۱۱۶۱ھ۔ مئی ۱۷۴۸ء) سے ہے، تو کس طرح؟

کیوں کہ اول تو یہ ثابت نہیں کہ ملا نظام الدین نے کوئی ایسا نصاب علیحدہ یا خاص تعلیم مرتب فرمایا ہو، جو ملا صاحب کے حلقۂ درس اور ان کے شاگردوں میں معمول ومروج تھا اور اسی ترتیب پر بعد کی نسلوں کو بھی منتقل ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ ملا نظام الدین صاحب نے ایسا کوئی نصاب مرتب نہیں کیا(۱) اگر کیا بھی ہو تو وہ اب موجود نہیں، بلکہ اس کی تفصیلات بھی مفقود ہیں۔

(۱) ملا صاحب کا قریب ترین تذکرہ علامہ غلام علی آزاد بلگرامی نے ''مآثر الکرام'' (مؤلفہ ۱۱۶۶ھ) میں کیا ہے۔ ص: ۲۲۰/۲۲۴ طبع اول (آگرہ: ۱۳۲۸ھ ۱۹۱۰ء) مگر اس میں ملا صاحب کے کسی نصاب کا ذکر نہیں، نیز اس وقت کے مورخین اور تذکرہ نگاروں سے تذکرہ علمائے ہند، مؤلفہ مولوی رحمان علی انامی ص: ۲۴۱/۲۴۲ (طبع دوم۔ نول کشور لکھنؤ ۱۳۳۲ھ ۱۹۱۴ء) تک، کسی نے بھی اس نصاب تعلیم کا تذکرہ نہیں کیا۔ اس خانوادہ کے ایک فاضل اور مولانا ملا نظام الدین پر فاضلانہ کتاب: ''بانی درس نظامی'' کے مؤلف محمد رضا انصاری صاحب نے بھی اپنی کتاب میں ایک پورا باب درس نظامی پر لکھا ہے۔ ص: ۲۵۹-۲۶۹ (لکھنؤ ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء) مگر اس سے بھی یہ رہنمائی نہیں ملتی کہ ملا صاحب نے یہ نصاب کب مرتب فرمایا تھا اور اس کا استناد کس طرح ثابت ہے۔

نیز جن چند خاص کتابوں یا موضوعات کی وجہ سے اس نصاب کو درس نظامی کہا جاتا ہے، ان میں سے کئی اک تو وہ ہیں جو ملا فتح اللہ شیرازی کی باقیات اور ان کے علمی معقولی اثرات کا ایک حصہ ہیں، چند ایسی بھی ہیں جو ملا صاحب کی وفات کے بعد وجود میں آئیں تھیں، اس لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ ملا صاحب نے ان کتابوں کو پڑھایا بلکہ دیکھا بھی ہو، اور جو کتابیں بنیادی اصول وقواعد اور فقہ ودینیات پر مشتمل ہیں، ان میں سے اکثر کتابیں صدیوں سے ہندوستان کے مختلف حلقہ ہائے درس میں زائج اور قدیم ترین نصاب ہائے تعلیم کا حصہ رہی ہیں، اس لئے ان کو بھی ملا صاحب کے نظام سے وابستہ اور مختص نہیں کہا جاسکتا، لہٰذا اس نصاب کی ملا صاحب سے نسبت درست نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ہمارے مدارس میں جو نصاب تعلیم تقریباً ڈیڑھ سو سال سے معمول ومروج ہے، وہ برصغیر ہند کے چار اہم نصاب یا حلقہائے درس کا خلاصہ وانتخاب ہے:

(۱) خاندان علمائے فرنگی محلیؒ

(۲) حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے اسلاف واخلافؒ کا نصاب تعلیم

(۳) علمائے خیرآباد کا نصاب درس

(۴) دہلی کالج کا نصاب تعلیم

ان چاروں کے اثرات کو اس طرح سمجھا اور تقسیم کیا جاسکتا ہے:

اس نصاب میں شامل کتب حدیث اور صحاح ستہ کا اہتمام حضرت شاہ ولی اللہؒ اور خانوادۂ ولی اللہیؒ کا فیضان ہے، فقہ حنفی کی اہم کتابیں اس نصاب درس کا حصہ تھیں، جو عہد مغلیہ بلکہ اس سے بھی پہلے عہد سلطنت سے ہندوستان کے علمی حلقوں میں جاری تھا۔ منطق وفلسفہ کا شغف مولانا ملا نظام الدین اور فتح اللہ شیرازی کا اثر ہے۔ فلسفہ یونان کی قدیم اور دقیق کتابوں شفا شیخ الرئیس ابن سینا، اسفار اربعہ ملا صدرا شیرازی، شرح اشارات محقق طوسی، افق المبین میر باقر داماد وغیرہ کا ذوق علمائے خیرآباد کا ورثہ ہے۔ عربی ادب کی کتابیں خصوصاً معلقات، جاہلی شعراء، نیز حماسہ، متنبی وغیرہ دہلی کالج سے منتقل ہوئی ہیں۔

دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کے بانیان گرامی، جو خاندان حضرت شاہ ولی اللہ کے دست گرفتہ اور جرعہ نوش تھے، دہلی کالج کے فیض علم سے بھی مملو تھے اور معقولات کے قدیم سلسلوں سے بھی فیض

پائے ہوئے تھے، اس لئے وہ ان تمام نسبتوں صلاحیتوں اور علوم کے جامع تھے، انہوں نے اپنے مدارس کے لئے مرتب اس نصاب تعلیم میں، تمام نسبتوں اور چشمہ ہائے علم سے استفادہ کا اعتراف کیا اور نصاب کی تشکیل کے وقت ہر اک سے استفادہ کا خیال رکھا۔

اس قدیم نصاب کے اکثر مرتب کرنے والوں کے ذہن ومزاج میں، اعلیٰ درجہ کے سرکاری اداروں، کالجوں میں مسند درس وتعلیم سنبھالنے، شعبۂ تعلیم میں معزز عہدوں پر فائز رہنے اور اکثر علوم وفنون کو اعلیٰ درجہ کے استادوں سے پڑھنے اور لمبے عرصہ تک ان کو پڑھانے اور گہرے تعلیمی تجربات کی وجہ سے، ایک خاص قسم کی جامعیت، رچاؤ اور اثراندازی کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی، سنہ ۱۸۵۷ء کی تحریک نے جب پرانے تمام مدارس اور مراکز تعلیم کو بے نام ونشان کردیا، تو ان حضرات نے اپنے علمی تعلیمی تجربہ کو، نئے ماحول اور مستقبل کی ضروریات کے پیش نظر نئے انداز سے مرتب کیا، یہی وہ سب سے پہلا نصاب تعلیم ہے جو ان حضرات نے، دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور دونوں میں، ان کے قیام اور پہلے تعلیمی سال کے وقت مرتب اور نافذ فرمایا تھا۔

دیوبند وسہارنپور کے دونوں اسلامی مدرسے (جو بعد میں دارالعلوم اور مظاہر علوم کے نام سے موسوم ومشہور ہوئے) ایک ہی سال میں، ایک ہی مقصد کے لئے ایک ہی نہج پر قائم ہوئے تھے۔ دارالعلوم کا افتتاح یکم محرم الحرام سنہ ۱۲۸۳ھ (۱۶ رمئی ۱۸۶۶ء) کو ہوا تھا، مظاہر علوم کا اس کے چھے مہینہ بعد، رجب ۱۲۸۳ھ/۲۴ رنومبر ۱۸۶۶ء کو۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ دونوں مدرسوں نے اپنے آغاز کے ساتھ ہی، دس سال کا مکمل نصابِ تعلیم منتخب اور وضع کرلیا تھا، جس سے ان مدارس کے بانیین کی بلند نظری، رفعت پرواز اور نہایت دوررس منصوبوں اور عالی مقاصد کا بھی ضمناً اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ صرف ایک اتفاق یا توارد نہیں کہ دونوں مدرسوں کے ذمہ داروں نے سال اول یا آغاز تعلیم سے فراغت وفضیلت یا آخری کتابوں تک، عربی کی کتابوں اور دینیات کا نصاب ایک ہی طرح کا اور ایک ہی نہج پر مرتب فرمایا تھا، اگرچہ مظاہر علوم کے نصاب میں چند (صرف پانچ) کتابیں دارالعلوم سے زائد تھیں۔

اس ابتدائی نصاب میں حدیث شریف کی اعلیٰ ترین کتابوں کی ایک خاص ترتیب پر تعلیم کے علاوہ بھی جو جامعیت وہمہ گیری ہے، وہ لائق توجہ ہے۔ عقلی علوم خصوصاً ہیئت (MORPHOLOGY)

ہندسہ (GEOMETRY) اور ریاضی (ARITHMATIC) وغیرہ کی ضروری فنی تعلیم، فارسی کا اعلیٰ درجہ کی کتابوں کے ذریعہ فاضلانہ درس، عربی و فارسی اردو، تینوں زبانوں سے ایک دوسری زبان میں ترجمے کی لیاقت اور مہارت تھی، یہی اس نصاب کا خاص جوہر اور بنیادی حصہ تھا۔ اس وقت کے نصاب اور بعد کے معمول نصابات میں ایک بہت نمایاں اور واضح فرق یہ ہے کہ دارالعلوم میں چھٹے درجہ اور مظاہر میں آخری درجات تک، فارسی کی اعلیٰ درجہ کی فنی تعلیم اور ریاضی ضروری تھی، جس میں درجہ بہ درجہ ترقی ہوتی رہتی تھی۔

ایک اور بڑا موضوع یا پہلو جس سے درس میں شامل، تمام کتابوں اور علوم وفنون میں طاقت آتی تھی اور جملہ موضوعات کو فنی قوت ملتی تھی، ترجمہ کی صلاحیت کا تھا۔ فارسی کی پہلی جماعت سے تعلیم کے اختتام تک، ہراک درجہ اور جماعت کے لئے ضروری تھا کہ وہ ترجمہ کے فن میں بھی مہارت ودسترس حاصل کریں، جس کی ابتدا اردو کے فارسی اور فارسی کے اردو ترجمہ سے ہوتی تھی، اس کے بعد اردو سے عربی، عربی سے اردو، فارسی سے عربی، عربی سے فارسی اور دونوں سے اردو میں ترجمہ پر محنت کرائی جاتی تھی، جیسے جیسے طالب علم تعلیمی درجات میں آگے بڑھتا، اس کی ترجمہ کی لیاقت بڑھتی چلی جاتی تھی۔

دونوں مدرسوں کا نصاب تعلیم دس یا گیارہ سال کا تھا، دارالعلوم کا دس سال کا، مظاہر کا گیارہ سال کا۔ جو قرآن مجید کے علاوہ کہ وہ تو اصل اصول علوم ہے، عربی فارسی کی تمام کتابوں میں بڑی حد تک مشترک تھا، مظاہر علوم میں پہلا سال قرآن مجید کی تکمیل اور ابتدائی فارسی کے لئے مختص تھا، دارالعلوم کے نصاب کا قرآن کریم کی تکمیل کے بعد، فارسی کی ابتدائی کتابوں سے آغاز ہوتا تھا، اس کے بعد، دونوں مدارس کے مجموعی نصاب کی درجہ بہ درجہ تفصیل درج ذیل ہے:

۱-سال اول ـــــ میزان منشعب، صرف میر [مظاہر علوم میں ان پر، وغیرہ کا اضافہ ہے]

۲-سال دوم ـــــ دستوار المبتدی، شرح مائۃ عامل، نحو؟

۳-سال سوم ـــــ ہدایۃ النحو، ایساغوجی، منیۃ المصلی، مراح الارواح

۴-سال چہارم ـــــ کافیہ، تہذیب، قال اقول مرقاۃ، قدوری، فصول اکبری [مظاہر کے نصاب میں تہذیب شامل نہیں]

۵-سال پنجم ـــــ شرح ملا جامی، شرح تہذیب، شرح وقایہ، شافیہ، مقامات ہندی، کلیلہ ودمنہ، [مظاہر میں کلیلہ ودمنہ شامل نہیں تھی]

۶-سال ششم —— قطبی، میر قطبی، مختصر معانی، اصول الشاشی، نورالانوار، مقامات حریری [مظاہر میں شرح فقہ اکبر کا اضافہ تھا]

۷-سال ہفتم —— میبذی، شرح عقائد توضیح وتلویح، سراجی، دیوان متنبی۔

۸-سال ہشتم —— جلالین، مشکوٰۃ، ترمذی، تاریخ یمینی، علم ادب (کذا؟) [مظاہر میں تیسیر الوصول الیٰ جامع الاصول کا اضافہ تھا]

۹-سال نہم —— بیضاوی، ہدایہ، ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی [مظاہر علوم میں سبعہ معلقہ کا اضافہ تھا]

۱۰-سال دہم —— صحیح بخاری، صحیح مسلم، موطا امام مالک [مظاہر میں تین کتابوں کا اضافہ تھا: ترجمہ قرآن مجید، خطبہ قاموس، درمختار]

تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ دس یا گیارہ سال کا لمبا نصاب تعلیم، صرف پینتالیس کتابوں پر [مظاہر علوم میں پچاس کتابوں پر] مشتمل تھا۔ یعنی ہر اک سال میں اوسطاً پانچ کتابیں پڑھائی جاتی تھیں، جو تمام بنیادی، فنی اصولی کتابیں تھیں، عموماً چار یا پانچ کتابوں میں پورا فن پڑھا دیا جاتا تھا۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے:

(۱) صَرف کی صِرف تین کتابیں تھیں: دستور المبتدی۔ فصول اکبری۔ شافیہ۔

(۲) نحو کی چھے: نحو میر۔ شرح مأۃ عامل۔ ہدایت النحو۔ مراح الارواح۔ کافیہ اور شرح جامی۔

(۳) منطق کا نصاب بھی فقط چھے کتابوں کا تھا: ایساغوجی۔ قال اقول۔ مرقاۃ۔ شرح تہذیب، قطبی میر قطبی۔

(۴) فلسفہ کی صرف ایک کتاب شامل تھی: میبذی۔

(۵) معانی وبیان اور بلاغت میں صرف ایک کتاب تھی: مختصر معانی۔

(۶) عقائد میں دارالعلوم میں صرف ایک کتاب تھی: شرح عقائد [مظاہر علوم میں اس سے پہلے شرح فقہ اکبر بھی پڑھائی جاتی تھی]

(۷) اصول فقہ صرف تین کتابیں تھیں: اصول الشاشی۔ نورالانوار۔ توضیح وتلویح۔

(۸) فقہ میں پانچ کتابیں: منیۃ المصلی۔ قدوری۔ شرح وقایہ۔ ہدایہ اور سراجی [مظاہر میں درمختار بھی مکمل پڑھائی جاتی تھی]

(۹) عربی ادب جو نصاب کا ایک مرکزی حصہ تھا، اس میں چھ کتابیں پڑھائی جاتی تھیں: منتخبات ادب عربی۔ مقامات ہندی۔ کلیلہ ودمنہ۔ مقامات حریری۔ دیوان متنبّی اور تاریخ یمنی [مظاہر علوم میں سبعہ معلقہ کا اضافہ تھا]

(۱۰-۱۱) یہ اصول اور معقولات کی کتابیں تھیں، کلیدی علوم جو اس نصاب کا مقصد تھے، یعنی تفسیر قرآن مجید، حدیث شریف، تفسیر میں جلالین کو اولیت حاصل تھی، اس کے بعد بیضاوی کا نصف اول یا کچھ حصہ پڑھایا جاتا تھا، مظاہر علوم میں قرآن مجید کا مکمل ترجمہ بھی داخل نصاب تھا۔

حدیث میں مشکوۃ المصابیح کے علاوہ صحاح ستہ اور مؤطا امام مالک پڑھائی جاتی تھیں [مظاہر علوم میں تیسیر الاصول بھی شامل نصاب تھی]

درج بالا نصاب حضرت شاہ ولی اللہؒ کے مرتبہ نصاب نیز خانوادۂ ولی اللہی اور دہلی کالج میں رائج نصاب تعلیم کا عمدہ خلاصہ ہے۔ یہ دونوں مراکز طالب علم میں جو صلاحیتیں پیدا کرنی چاہتے تھے اور جس طرح کے افراد تیار کرنا چاہتے تھے، اس نصاب میں ان دونوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ ہمارے مدارس کے بانیوں نے دونوں نصابوں کا عمدہ امتزاج کرکے اعلیٰ قابلیت کے اصول کا اہتمام بھی کیا ہے اور حضرت شاہ ولی اللہ کے طریقہ اور مقاصد تعلیم کی پاسداری کا بھی۔

اس نصاب میں کئی باتیں موجودہ مشہور ومعمول نصاب سے مختلف ہیں: پہلے نصاب میں عربی ادب خصوصاً قدیم عربی کی تفہیم اور نظم ونثر کی تعلیم کی ایک مسلسل ترتیب ہے، سال چہارم میں کافیہ کے ساتھ عربی ادب کی منتخب کتابیں شروع ہوجاتی تھیں، جو نصاب کے مکمل ہونے تک ترقی کرتی ہوئی چلی جاتی تھیں۔

حدیث شریف کی تعلیم کے لئے تین سال مختص کئے گئے تھے، جس کی ترتیب نہایت عمدہ تھی، پہلے سال میں مشکوٰۃ کے ساتھ سنن ترمذی ہوتی تھی، دوسرے سال میں سنن ابوداؤد، سنن نسائی اور ابن ماجہ۔ درس حدیث کے تیسرے اور آخری سال میں صحیح بخاری، صحیح مسلم اور موطا امام مالک پڑھائی جاتی تھیں، جس سے حدیث شریف سے گہری مناسبت پیدا ہوجاتی، صحاح ستہ کے امتیازات واختلافات کا بھی خاصا علم ہوجاتا تھا اور حضرت شاہ ولی اللہ کے طریقۂ تعلیم اور ترجیح مؤطا کے اصول پر بھی عمل ہوجاتا تھا۔ اگر موجودہ دور اور نصاب ہائے تعلیم میں بھی دورۂ حدیث شریف یا صحاح ستہ کے اسی ترتیب کے مطابق پڑھانے کا اہتمام ہوتو خدمت وتعلیم اور مقاصد حدیث کی تفہیم کے لئے یہ موجودہ طریقۂ تعلیم (بلکہ تلاوت) سے بہت بہتر مفید

اورزیادہ نفع بخش ثابت ہوگا، ان شاء اللہ تعالیٰ! اس سے حدیث شریف کے مقاصد ومطالب کی بھی زیادہ توضیح وتشریح ہو سکے گی اور طلبہ کو حدیث شریف میں بھی دیر تک غواصی اور استفادہ کا موقع نصیب ہوگا۔

قدیم نصاب میں منطق وفلسفہ کے دیر تک پڑھنے کا معمول نہیں تھا، متوسطات میں قطبی اور میر قطبی منطق کی آخری کتابیں تھیں، جو نصاب درس میں شامل تھیں، اس کے بعد منطق کا کچھ تذکرہ نہیں۔ فلسفہ قدیم کی صرف ایک کتاب میبذی تھی، جو سال ہفتم میں پڑھائی جاتی تھی، اس پر فلسفہ کی تعلیم کا باب بھی بند ہو جاتا تھا۔ علمائے مظاہر علوم تو منطق وفلسفہ کی مزید تعلیم کو مدرسہ کے مقاصد سے ہی خارج کئے ہوئے تھے، وہ اس کو مدرسہ کے لئے چندہ دینے والوں کی نیت کے خلاف سمجھتے تھے۔ ذمہ داران مظاہر علوم کا فرمان تھا کہ:

"ان لوگوں نے ثواب آخرت کے لئے چندہ دیا ہے، اس لئے وہی علوم پڑھانے چاہئیں جن سے آخرت مطلوب ہو" (۱)

اس صراحت کے ساتھ ان عقلی کی فہرست اور تفصیل بھی دیکھئے جو مظاہر علوم کے علاوہ دارالعلوم کے نصاب کا جزء لاینفک اور بنیادی حصہ بنے ہوئے تھے جس سے یہ بات بے تکلف سمجھ میں آتی ہے کہ ان مدرسوں کے جلیل القدر بانیین خوب جانتے ہیں اور سمجھتے تھے کہ مدرسہ کے نصاب میں شامل عقلی علوم کی شمولیت کے بغیر ویسے افراد نہیں پیدا ہو سکتے جو ان مدرسوں کا بنیادی مقصد اور سرمایہ ثابت ہوں۔

یہ عربی نصاب کی تفصیل تھی لیکن ان مدارس کے نصاب اور سلسلۂ تعلیم کا اسی پر اختتام نہیں ہو جاتا تھا، بلکہ اس کے ساتھ (جیسا کہ ذکر ہوا) تین موضوعات اور بھی تھے، جو تکمیل نصاب کے لئے گویا شرط کی حیثیت رکھتے تھے، جس میں اول درجہ فارسی کا تھا۔ دیوبند اور سہارنپور دونوں کے مدارس میں، تعلیم کے آغاز سے فارسی کی اعلیٰ درجہ کی فنی تعلیم کا بھی اہتمام فرمایا گیا تھا، جو دونوں مدرسوں میں چوتھے درجہ تک ایک ہی ترتیب پر تھا، وہی کتابیں ویسا ہی طریقۂ تعلیم اور طلبہ پر اس کی ویسی ہی ذمہ داری تھی۔ فارسی کتابوں کا نظام تعلیم اور اسباق کی ترتیب یہ تھی:

سال اول میں: گلستاں، صفوۃ المصادر، انشائے خلیفہ

سال دوم میں: بوستاں، زلیخا، مصدر فیوض

(۱) روداد مدرسہ عربیہ (مظاہر علوم) سہارنپور سنہ ۱۲۹۱ھ ص: ۶

سال سوم میں: انوار سہیلی، رقعات عالمگیری، رسالہ عبدالواسع، رسالہ روشن علی انصاری

سال چہارم میں: ابوالفضل، سکندر نامہ

مندرجہ بالا کتابیں دارالعلوم اور مظاہر علوم دونوں میں مشترک تھیں، دارالعلوم میں فارسی کا اسی پر اختتام ہو جاتا تھا، لیکن مظاہر علوم میں دورۂ حدیث کے اختتام تک فارسی کی تعلیم جاری رہتی تھی، جس کے لئے کتابوں کا نہایت عمدہ انتخاب کیا گیا تھا، تفصیل ملاحظہ ہو:

سال پنجم میں: مدارج النبوۃ، [سیرت شریفہ تالیف: علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ] جواہر الترکیب

سال ششم میں: نفحات الانس [تذکرہ اولیاء اللہ تالیف: مولانا ملا عبدالرحمان جامی] اخبار الاخیار [تذکرہ مشائخ وعلمائے ہند، تالیف: علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی]

سال ہفتم میں: اخلاقِ جلالی [علامہ جلال الدین دوّانی] علم عروض

سال ہشتم میں: قصائد عرفی [شیرازی] معارج النبوۃ [سیرت شریفہ، تالیف، ملا معین کاشفی ہروی]

سال نہم میں: تزک جہانگیری [خودنوشت وسرگذشت نورالدین جہانگیر]

سال دہم میں: تحفۃ العراقین [خاقانی]

یعنی یہ نصاب اصول وقواعد، زبان وادب، سیرت وتاریخ، تصوف واخلاق وغیرہ بنیادی اہم موضوعات کا بہترین معلم اور نمائندہ وترجمان تھا۔ قواعد واصول کی معتبر کتابیں رسالہ عبدالواسع، رسالہ روشن علی انصاری اور جواہر الترکیب فارسی کی فنی قابلیت میں اضافہ کرتی تھیں، زبان وادب کے جوہر گلستاں، بوستاں، رقعات عالمگیری سے کھلتے تھے، اخلاق وتربیت کا سبق انوار سہیلی اور اخلاق جلالی سے ملتا تھا، سیرت پاک کی تفصیل اور روایات مدارج النبوۃ اور معارج النبوۃ سے حاصل معلوم ہوتی تھیں، امت کے مشہور بزرگوں اور اولیاء اللہ کے احوال وملفوظات ملا جامی کی نفحات الانس سے معلوم ہو رہے تھے، ہندوستان کے اکابر علماء اور مشائخ سے واقفیت کے لئے شیخ عبدالحق محدث کی اخبار الاخیار مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی تھی اور رکھتی ہے، تاریخ ہند سے واقفیت کے لئے تزک جہانگیری سے استفادہ ہو رہا ہے، جو فارسی میں تاریخ اور خودنوشت سوانح کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ فارسی ادب کی اعلیٰ قابلیت میں جو کمی کمزوری رہ گئی ہو اس کی تلافی کے لئے عرفی کے قصائد اور (خاقانی کی) تحفۃ العراقین بے نظیر سرمایہ ہے۔

یہ تمام کتابیں عربی درسیات کے جلو میں چلتی تھیں، چند سبق عربی درسیات کے چند فارسی کے۔ ان

دونوں زبانوں کی علمی قابلیت کے ساتھ، دونوں بلکہ تینوں زبانوں میں ترجمہ کی یکساں لیاقت سونے پر سہاگہ کا کام کرتی تھی، اس لئے جب کوئی طالب علم مظاہر علوم یا دیوبند سے ان علوم وفنون سے آراستہ ہوکر نکلتا تھا، تو دنیا اس کے استقبال کے لئے چشم براہ ہوتی، اس کو معاش کی جستجو نہ کرنی پڑتی تھی، ذرائع معاش خود اس کی تلاش میں رہتے تھے، علم وفضل کے قدرداں اور باصلاحیت افراد کے متلاشی ان فارغین کو ہاتھوں ہاتھ لیتے، جس کی وجہ سے ان کا مدرسہ سے نکلنے کے بعد ہر اک قدم ترقی وکامرانی اور اکثر حالات میں معاش کی فراوانی کی طرف بڑھتا تھا۔ وہ جو کہا گیا ہے کہ:

کعبہ را ہردم تجلی می فزود
ایں ز اخلاصات ابراہیم بود

کچھ ایسی ہی کیفیت ان مدارس سے فارغ طلبہ کی بھی ہوتی تھی، جو بلاشبہ ان مدارس کے بانیین کے اخلاص کے علاوہ اس عمدہ جامع اور بہترین نصاب تعلیم کا بھی اثر تھا۔

اگرچہ یہ استعداد وصلاحیت مدرسوں کے فارغین کے لئے ایک تمغہ اعزاز تھی، مگر ان دونوں مدرسوں کا نصاب مرتب کرنے والے حضرات نے صرف اس لیاقت کو کافی نہیں سمجھ لیا تھا، بلکہ انہوں نے درج بالا موضوعات کے علاوہ علوم عقلیہ، ریاضی ہندسہ (GEOMETRY) ہیئت (MORPHOLOGY) کو بھی نصاب کا ضروری حصہ بنادیا تھا، جو اکثر حالات میں اختیاری (OPTIONAL) نہیں، بلکہ لازمی (COMPULSARY)

(۱) یہ مفصل نصاب تعلیم مدرسہ عربیہ (دارالعلوم) دیوبند اور مدرسہ عربیہ [مظاہر علوم] سہارنپور کی سال اول کی روداد میں چھپا ہے۔
دارالعلوم کی سال اول کی روداد، بلکہ دارالعلوم کی سال آغاز سے سنہ ۱۳۲۰ھ تک تمام رودادوں کی دو، دو اشاعتیں ہیں، پہلی اشاعت وہ ہے جو مدرسہ کے معمول کے مطابق ہر اک نئے ہجری سال کے آغاز پر چھپتی تھی، دوسری اشاعت وہ ہے جو مطبع، قاسمی دیوبند سے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے اہتمام سے شائع ہوئیں تھیں، چوں کہ پرانی تمام رودادیں کم یاب اور خستہ ہوگئی تھیں اس لئے مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے پہلے سال کی روداد سے سنہ ۱۳۲۰ھ تک بلکہ اس کے بعد کی بھی تمام رودادوں کے سوسوڈیڑھ سو نسخے نئی کتابت سے چھپوادیئے تھے، راقم نے دونوں اشاعتوں سے استفادہ کیا ہے۔ سال اول کی روداد کا ایک قلمی نسخہ بھی میرے سامنے رہا ہے، جو غالباً حضرت نانوتوی کے ایک شاگرد اور دارالعلوم کے ابتدائی طالب علم مولانا فاضل پھلتی کے قلم کا ہے۔ [بشکریہ مولانا حکیم رضی الدین احمد صاحب پھلت، مظفر نگر]
مظاہر علوم کے پہلے سال کی روداد جو اس دور کے ایک ہفت روزہ، نجم الاخبار میرٹھ کے ضمیمہ کے طور پر چھپی تھی، راقم سطور کے سامنے ہے۔ [بشکریہ مولانا محمد شاہد صاحب سہارنپور]

تھا۔طلبہ کے لئے ضروری تھا کہ وہ ان مضامین کو پڑھیں اور ان میں مہارت حاصل کریں۔ان مدرسوں کے بانی اور سربراہان اچھی طرح جانتے تھے کہ ریاضی وغیرہ کی عمدہ صلاحیت ذہن کے نشو ونما کے علاوہ، متعدد دینی علوم کی تفہیم اور اکثر دنیاوی معاملات ومسائل کو جانچنے اور ان میں ترقی کے لئے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

دارالعلوم اور مظاہرعلوم دونوں میں پہلی جماعت سے درجۂ ششم تک ریاضی اور اس کے متعلقات نصاب میں شامل تھے، جو سال اول میں جمع وتفریق کے حساب سے، سال ششم میں اقلیدس کی شکل اول تک آگے بڑھتے، ترقی کرتے تھے۔

یہ وہ نصاب اور علوم تھے جن کو دارالعلوم دیوبند اور مظاہرعلوم کے بانیان گرامی مرتبت نے اپنے مدرسوں کے طالب علموں اور ملت کے تازہ وارد نونہالوں کے لئے مرتب ومنتخب فرمایا تھا، مگر بعد میں موقع بہ موقع اس میں اس قدر ترمیمات ہوئی ہیں کہ موجودہ نصاب کو ان حضرات کے مرتبہ، سب سے پہلے نصاب سے گویا کوئی نسبت ہی باقی نہیں رہی۔ریاضی وغیرہ تو برسوں سے نصاب بلکہ بحث وگفتگو سے بھی خارج ہے، فارسی کو بھی شابخیر مابسلامت کہدیا گیا ہے، گنتی کے چند مدارس ہیں جہاں فارسی کی تعلیم کا کچھ سلسلہ وانتظام ہے بہ ظاہر وہ بھی کچھ دنوں میں قصۂ ماضی ہوا چاہتا ہے۔سب سے بڑا تغیر جس سے اس نصاب کی روح اور مردم گری وشخصیت آفرینی کا جوہر غیر معمولی طور سے متاثر ہوا ہے، حدیث شریف کے طریقۂ تعلیم میں تبدیلی اور عربی زبان کی لیاقت وتعلیم پر گہری توجہ کا فقدان نیز ترجمہ کے فن سے قطعاً اور گویا دائمی بے تعلقی ہے، اس لئے عرصہ سے نہ ویسے افراد پیدا ہورہے ہیں، نہ ہی موجودہ تعلیم کے ویسے اثرات ونتائج ظاہر ہورہے ہیں۔

اس نصاب کا ایک غیر معمولی فائدہ اور امتیاز یہ تھا کہ اس نصاب سے جو طلبہ اسی ترتیب کے مطابق تعلیم مکمل کرلیتے تھے وہ مدرسہ سے فارغ ہوتے ہی، بیک وقت استاد معلم، محقق مصنف اور مترجم ہر کام اور منصب کے لائق ہوتے تھے، ان کے ذریعہ سے مدرسوں کا نظام بھی حسن وخوبی کے ساتھ آگے بڑھتا رہتا تھا نیز یہ فارغین ہر اک علمی ضرورت کے عمدہ طریقہ پر پورا کرنے والے ثابت ہوتے تھے، جس کی وجہ سے مطابع اور ناشرین کو اچھے ذی علم حاشیہ نگار، تصحیح کرنے والے بھی مل جاتے تھے اور علمی دنیا بھی ان کی تصنیف وتحقیق اور نئی کتابوں

کے ترجموں سے اپنے علم میں اضافہ محسوس کرتی تھی، ترجمے بھی ایسے جو علمی لیاقت واستعداد میں اضافہ کا سامان ثابت ہوتے تھے، اصل کتابوں کے قاتل اور بے بضاعتی کا دفتر نہیں لگتے تھے، ترجموں کی متواتر مصروفیت کے علاوہ، اعلیٰ عمدہ کتابوں کی تصنیف کا معمول بھی تازہ و برقرار رہتا تھا۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی بہت ضروری ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے سنہ ۱۲۹۰ھ (جنوری ۱۸۷۴ء) میں دارالعلوم کے جلسہ سالانہ میں مدارس کے نظام اور مقاصد پر ایک اہم اور معرکہ آرا تقریر فرمائی تھی، جس میں اس کی صراحت فرمائی تھی کہ علوم دینیہ اسلامیہ کی تکمیل کے علاوہ، ہماری غرض اعظم یہ بھی ہے کہ طلبہ میں ایسی اعلیٰ درجہ کی ذہنی قوت پیدا اور بیدار ہو، جس کے ذریعہ سے وہ قدیم علمائے اسلام کے ہم قدم شمار ہو جائیں، ان کا نمونہ اور مثنیٰ بن سکیں۔ حضرت مولانا کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ''ان مدارس میں علاوہ تعلیم مذہبی غرض اعظم قوت استعداد ہے، فقط علوم دینی پر اکتفاء نہیں، بلکہ فنون دانشمندی کی تکمیل بھی حسب قاعدہ سابقہ کی گئی ہے۔ جس کا عمدہ نتیجہ پہلے زمانوں میں یہ ہوا تھا کہ بڑے بڑے عالم، بڑی بڑی استعداد و قوت کے اہل اسلام میں بہ کثرت پیدا ہوئے''

حضرت نانوتوی کا یہ ارشاد برصغیر ہند میں سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد قائم، تمام مدرسوں اور دینی تعلیمی اداروں کے لئے ایک اصول اور نظریہ ساز دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور تمام مدارس کے مقاصد کا ایک اہم ترجمان بھی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اگرچہ ان مدارس کی وجہ تاسیس اور ان کا اصل بنیادی مقصد، علوم دینیہ اسلامیہ شرعیہ کی حفاظت و بقاء کی جد و جہد اور ان کی تعلیم و اشاعت کی فکر کرنا ہے، ان مدارس کے قائم کرتے وقت اسی کو اصل اصول بنایا گیا تھا مگر معقولات میں منطق و فلسفہ کے علاوہ وہ، تمام عقلی فکری موضوعات اور علوم و مباحث (جن سے نظام عالم جڑا ہوا ہے) بھی، ان مدارس کے مقاصد اور نصاب تعلیم سے خارج نہیں تھے۔ کیوں کہ وہ حضرات اس حقیقت سے بہت گہرائی سے واقف تھے کہ اگر ان مدرسوں کے فارغین دین و شریعت میں اعلیٰ صلاحیت کے ساتھ، ضروری عقلی علوم سے بھی آشنا ہوں گے، تو ان کا دائرہ فکر و عمل بہت وسیع ہو جائے گا اور ان کی رہنمائی اور جد و جہد کے اثرات و ثمرات، زیادہ عمیق اور ایسے دور رس نتائج پیدا کرنے والے ہوں گے، جس طرح قدیم زمانہ کے منتخب روزگار علماء اور ماہرین کے ہوتے تھے۔ حضرت مولانا نانوتوی کی رائے میں معقولات کا دائرہ کس درجہ وسیع تھا، اس کی اسی تقریر کے ایک اور اہم فقرہ سے وضاحت ہو رہی ہے، فرماتے ہیں:

''معقولات سے صرف منطق وفلسفہ مقصود نہیں، بلکہ اس میں ہئیت ،حساب ،فلکیات،
ریاضی اور الٰہیات بھی بھی شامل ہیں''(۱)

یعنی حضرت مولانا نانوتوی کے پیش نظر مستقبل کے لئے جو وسیع تعلیمی مقاصد اور دیرپا ہمہ جہت نظام تعلیم تھا، اس میں معقولات کے لئے صرف منطق وفلسفہ کی تجویز ونشاندہی نہیں تھی، بلکہ معقولات کو اس کے وسیع اور صحیح معنوں میں لیا گیا تھا، جس میں تمام قابل ذکر موضوعات کی تعلیم وتدریس بھی شامل تھی۔ حضرت مولانا کی صراحت کے مطابق وہ علوم جو (معقولات کا حصہ ہیں) ان مدارس میں پڑھائے جانے چاہئیں، یہ تھے:

حساب ———— MATHEMATICS

ہندسہ ———— GEOMETRY

ہیئت ———— MORPHOLOGY

فلکیات ———— COSMOLOGY

یہ بات بھی خاص توجہ چاہتی ہے کہ حضرت مولانا، دینی مدرسوں کے لئے ضروری عقلی علوم ومباحث میں:

الٰہیات [مابعدالطبعیات] METAPHYSICS

کو بھی شامل فرمارہے ہیں۔

اگرچہ حضرت مولانا اس کی تقریر میں تذکرہ نہیں، لیکن دارالعلوم ومظاہر علوم کی حضرت مولانا نانوتوی کی حیات میں شائع [وفات ۱۲۹۷ھ ۱۸۸۰ء] رودادوں سے صاف معلوم ہورہا ہے کہ ان دونوں مدرسوں میں، درج بالا علوم ومضامین کے علاوہ:

---

(۱) حضرت مولانا نانوتوی نے یہ تقریر مدرسہ دیوبند (دارالعلوم) کے سالانہ جلسۂ دستار بندی میں سنہ ۱۲۹۱ھ (۹ جنوری ۱۸۷۴ء) کو فرمائی تھی، یہ تقریر اس سال کی روداد میں چھپی تھی، مکمل تقریر کے لئے ملاحظہ ہو: روداد سنہ ۱۲۹۰ھ ص: ۱۰ تا ص: ۱۷ اور مذکورہ فقرہ کے لئے ص: ۱۵۔ مطبوعہ محرم ۱۲۹۱ھ (فروری ۱۸۷۴ء)۔ یہ تقریر دارالعلوم کی تاریخ پر متعدد اہم مآخذ میں ایک دستاویز اور نظریہ ساز تقریر کے طور پر بھی شامل ہے، مثلاً ملاحظہ ہو:

الف: روداد موتمر الانصار، مرادآباد: ۱۳۲۹ھ ۱۹۱۱ء مطبع قاسمی دیوبند

ب: ماہنامہ القاسم دیوبند کا دارالعلوم دیوبند نمبر (۱۳۶۰ھ) وغیرہ

الجبرا (یا جبر و مقابلہ)	ALGEBRA
مساحت	MENSURATION
اقلیدس	EUCLID'S ELEMENTS

بھی پڑھائے جاتے تھے اور شامل نصاب تھے۔ یہی نہیں بلکہ طلبہ میں مزید لیاقت وقابلیت کے لئے دواور موضوعات کی بھی اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا نظام بنایا گیا تھا، طب ومعالجات اور فن تعمیر ونقشہ سازی (Civil Engineering and Architect)

دارالعلوم قائم ہونے کے بعد دارالعلوم میں طب یونانی کی تعلیم جلد ہی شروع ہوگئی تھی، لیکن شروع میں تمام طبی کتابوں کی تعلیم کا اہتمام نہیں تھا، جس کا ذمہ داران مدرسہ کو خاصا احساس تھا، وہ طلبہ کی بہتری کے لئے طب یونانی کے نصاب کی فاضلانہ تعلیم وتکمیل چاہتے تھے، اس لئے سنہ ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) میں طب یونانی کی مکمل تعلیم کا انتظام فرمایا گیا، جس کا اعلان ان الفاظ میں شائع ہوا تھا:

> ''کیفیات سنین ماضیہ سے جملہ خیر خواہان مدرسہ کو واضح ہوا ہے کہ کتنے طلبہ اس مدرسہ سے علوم عربیہ میں عالم وفاضل ہوئے اور آئندہ کو انشاء اللہ ہونے والے ہیں، مگر ارباب مشاورت مدرسہ ہذا نے، جب فکر کامل دیگر فوائد رفاہ عام برادران اہل سلام پر کیا، تو ابھی تک ایک امر کثیر المنافع یعنی ترویج وتکمیل علم طب یونانی کی کمی ہے اور اس کی درستگی اور تکمیل ضروریات بلکہ واجبات میں سے ہے، کیوں کہ اس سے فائدہ عام ہے'' (۱)

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کو، جو دارالعلوم کے صدر مدرس اور علمی نگراں بھی تھے طب یونانی سے خاص دلچسپی تھی، مولانا طب کی چھوٹی بڑی کتابیں شوق سے پڑھاتے تھے۔ جب مدرسہ میں طب یونانی کی تکمیل کا اعلان وانتظام ہوا، اس وقت مدرسہ کے طبی نصاب کی بنیادی کتابیں یہ تھیں:

قانونچہ۔ اقصرائی۔ شرح اسباب۔ نفیسی۔ سدیدی۔ کلیات قانون شیخ۔ حمیات قانون۔

دارالعلوم کے امتحانات میں ان کتابوں کا بھی امتحان ہوتا تھا، اور ان کتابوں کے اچھے نمبرات کے طلبہ کے لئے نئے سال میں تعلیمی ترقی اور داخلہ میں مددگار ہوتے تھے، طب کی صرف رسمی تعلیم اور کتاب خوانی ہی نہیں تھی

(۱) روداد سنہ ۱۲۹۵ھ۔ نیز روداد موتمر الانصار، مراد آباد ص: ۳۳

بلکہ اس کی عملی مشق بھی کرائی جاتی تھی اور اہل مدرسہ کی تمنا تھی کہ اگر مدرسہ میں جراحی کے عمدہ آلات [SURGICAL INSTRUMENTS] اور طب کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہو اور اہل مدرسہ کی اس قدر مالی معاونت کی جائے، جس سے اہل فن، صاحب نظر دواساز اصحاب کی خدمات حاصل کی جاسکیں تو فن دواسازی [PHARMACOLOGY] بھی طلبہ کو سکھایا جائے گا، جس سے اس فن کی تعلیم اور عملی مشق کو چار چاند لگ جائیں گے۔ سنہ ۱۲۹۶ھ کی روداد میں اس مقصد سے شائع ایک اعلان کی چند سطور ملاحظہ ہوں:

"اگر حضرات خیر خواہاں اس طرف کامل توجہ فرما کر، قوم کی بھلائی کے لئے امداد کامل کا فکر فرمائیں گے، تو آئندہ طلبہ کے لئے طریقۂ مطب اور فن جراحی اور تراکیب ادویہ کے سکھلانے کے سامان بھی مہیا کئے جاویں گے" (۱)

بلاشبہ یہ تمام اعلانات طب یونانی کے حوالہ سے ہیں، مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت سنہ ۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء) تک اور اس کے بعد کے دور میں بھی، انگریزی طریقۂ علاج (ALLOPATHY) ہندوستان میں متعارف نہیں تھا، پچانوے فیصد امراض میں طب یونانی سے رجوع کیا جاتا تھا، طب یونانی ہی اس وقت کا معروف ومقبول ترین طریقۂ علاج [SYSTEM OF TREATMENT] تھا۔ اگر اس وقت انگریزی طریقہ عام کو شہرت ومقبولیت حاصل ہوتی تو اکابرین مدرسہ دیوبند اس پر بھی غالباً اسی طرح توجہ مبذول رکھتے اور اس کی تعلیم سے غفلت نہ فرماتے ؟

یہ تو نصاب تعلیم کی بات تھی، اب یہ دیکھئے کہ ان مدارس اسلامیہ میں ان علوم وفنون کے پڑھانے کے لئے کیسے کیسے منتخب زمانہ اور نادر روزگار افراد جمع کئے گئے تھے، اس کا اس سے اندازہ کر لیجئے کہ مدرسہ دیوبند کے نائب صدر مدرس اور معقولات اور ریاضی وغیرہ کے ایک بڑے استاد، مولانا سید احمد دہلوی (۲) کے متعلق، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ایک تقریر میں فرمایا تھا:

---

(۱) روداد ص:　　　نیز روداد موتمر الانصار، مراد آباد ص: ۳۴

(۲) مولانا سید احمد دہلوی، مولانا میر سید محبوب علی دہلوی کے بھانجے اور ممتاز فاضل تھے، شعر ادب اور فارسی میں غالب کے شاگرد تھے، حدیث حضرت شاہ عبدالغنی مجددی سے پڑھی تھی۔ آخر میں دیوبند سے ترک ملازمت کرکے بھوپال چلے گئے تھے، بھوپال میں سنہ ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۳ء) میں وفات ہوئی۔ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی کے ایک شاگرد اور خلیفہ مجاز، قاری حسن رضا بھوپالی، مولانا سید احمد کے پرپوتے تھے۔

''مولوی سید احمد صاحب کو خداوند کریم نے ان فنون میں وہ استعداد و مناسبت عطا فرمائی ہے کہ ان فنون کے موجدوں کو بھی شاید اتنی ہی ہو'' (۱)

یہ تو صاحب خانہ کی شہادت تھی، ایک رائے اور پڑھ لیجئے جو ان دینی اداروں کی مخالف، برطانوی حکومت کے ایک اعلیٰ نمائندہ کے مشاہدہ پر مبنی ہے، اور ''الفضل ماشهدت به الاعداء'' کی ایک مثال ہے:

ممالک شمالی وجنوبی کے گورنر [سر جان اسٹریچی JOHN STRACHEY ۱۸۲۳ھ-۱۹۰۷ء] کا ۳۰/جنوری سنہ ۱۸۷۵ء (۲۱/ذی الحجہ ۱۲۹۱ھ) کو دیوبند میں قیام ہوا تھا، گورنر نے اپنے ایک دوست اور ایک بڑے سرکاری ملازم، جان پامر سے یہ کہا کہ یہاں مسلمانوں نے ایک مدرسہ جاری کیا ہے، تم اجنبی کے طور پر وہاں جاؤ اور دیکھو کہ وہاں کس طرح کی تعلیم ہو رہی ہے۔ جان پامر اس ہدایت کی تعمیل میں مدرسۂ دیوبند (دار العلوم) پہنچا، گھوم پھر کر خود تفصیلی جائزہ لیا اور اس کی رپورٹ گورنر کو پیش کی، اس کے اقتباسات لائق مطالعہ ہیں۔ ایک جگہ کہتا ہے:

''ایک جگہ ایک صاحب میانہ قد، نہایت خوبصورت بیٹھے ہوئے تھے، سامنے بڑی عمر کے طلبہ کی ایک قطار تھی، قریب پہونچ کر سنا تو علم مثلث کی بحث ہو رہی تھی، میرا خیال تھا کہ مجھے اجنبی سمجھ کر، یہ لوگ چونکیں گے مگر کسی نے مطلق توجہ نہ کی، میں قریب جا کر بیٹھ گیا اور استاد کی تقریر سننے لگا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ علم مثلث کے ایسے ایسے عجیب اور مشکل قاعدے بیان ہو رہے تھے، جو میں نے کبھی ڈاکٹر اسپرنگر (۲) سے بھی نہیں سنے تھے۔

یہاں سے اٹھ کر دوسرے دالان میں آ گیا تو دیکھا کہ ایک مولوی صاحب کے سامنے طالب علم معمولی کپڑے پہنے ہوئے بیٹھے ہیں، یہاں اقلیدس کے چھٹے مقالے کی دوسری شکل کے اختلافات بیان ہو رہے تھے اور مولوی صاحب اس برجستگی سے بیان

(۱) تقریر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ مندرجہ روداد دار العلوم سنہ ۱۲۹۳ھ ص: ۱۳۰۔ نیز روداد مؤتمر الانصار مراد آباد۔ ۱۳۲۹ھ ص: ۲۹

(۲) الیوس سپرنجر [ALOIS SPRIN GER] جرمن نژاد فاضل، مستشرق، جو ۱۸۴۴ء سے ۱۸۴۸ء تک دہلی کالج کا پرنسپل بھی رہا، الاصابہ شیخ الاسلام حافظ ابن حجر، اتقان علامہ سیوطی اور کشاف اصطلاحات الفنون علامہ قاضی محمد اعلیٰ وغیرہ کتابوں کا مصحح اور ان کی اشاعت کا منصوبہ ساز تھا۔

کرر ہے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اقلیدس کی روح ان میں آ گئی ہے‘‘

یہ رائے اس شخص کی ہے جو مغربی فنون و معقولات کا پتلا اور ڈاکٹر سپرنجر جیسے ماہرین فن کا تربیت یافتہ تھا۔ اگر ہمارے یہاں یہ روایت اور ان فنون کے ایسے استادوں کا تسلسل باقی رہتا تو منقولات [علوم اسلامیہ] اور معقولات کے تمام مباحث و مضامین ساتھ ساتھ چلتے اور یوں یہ مدرسے نہ صرف علماء اور مسلمانوں بلکہ پورے دنیا کے ماہرین فن کی تمناؤں کا مرکز اور جامعیت کی ایسی بے نظیر مثال ہوتے کہ تعلیم کی دنیا میں کسی کوان سے ’’من دیگرم تو دیگری‘‘ کہنے کا موقع ہی باقی نہ رہتا۔

یہاں یہ بات بھی معلوم رہنی چاہئے کہ منقولات کے ساتھ معقولات کی شمولیت اور دونوں کی مشترکہ تعلیم کا یہ نظام اور عقلی موضوعات پر مضامین کی مذکورہ ترتیب اور ان کی قرأت و تعلیم کا یہ سلسلہ، ان مدارس کے اولین بزرگوں کے ساتھ ختم نہیں ہو گیا تھا، بلکہ ان حضرات کے بعد جن بزرگوں نے اس سفینۂ علم و ہدایت کی پتوار سنبھالی اور کشتی ملت کو منجدھار سے نکال کر ساحل تک لانے کی متواتر جدو جہد فرمائی، وہ اور تمام معاملات واصول کی طرح، اس خیال اور نظریہ میں بھی اپنے بزرگوں کی مقررہ شاہراہ عمل پر قائم اور ان کے قدم بہ قدم تھے۔ ان سب حضرات نے بھی، جو صف اول کے بزرگوں کے بعد ان کے جانشین اور اس قافلۂ علم و عمل سے قائد و سالار تھے، اسی حکمت عملی اور طریقۂ تعلیم کو قائم و باقی رکھا تھا۔

اس مقصد کے لئے کی گئی ایک بڑی پرزور کوشش موتمر الانصار کا قیام تھا، موتمر الانصار کا پہلا بڑا اجلاس عام، ربیع الاول سنہ ۱۳۲۹ھ (اپریل سنہ ۱۹۱۱ء) میں مرادآباد میں منعقد ہوا تھا۔

اس اجلاس میں دارالعلوم کی بنیادی فکر، نظام تعلیم، طریقۂ تعلیم اور مقاصد تعلیم کا بھرپور اعادہ و تذکرہ ہوا تھا اور حضرات اکابر کے طریقۂ تعلیم اور منتخبات و معمولات کو اسی طرح قائم و باقی رکھنے اور اسی قدیم شاہراہ پر مضبوطی سے چلنے کا عزم کیا گیا تھا، جس میں معقولات کی مذکورہ بالا کتابوں سے متعلق حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کی ہدایت و ارشادات بطور خاص تازہ کئے گئے تھے اور اسی منہج کو باقی رکھنے کا عہد ہوا تھا۔ جس سے اس کی مکرر تصدیق ہوئی کہ یہ بزرگ معقولات کی تمام شاخوں کو چاہے وہ ابتدائی جزوی معلومات و تدریس پر مشتمل ہوں یا اعلیٰ مباحث و درجات پر، دینی علوم اور نصاب کی تکمیل کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ یہی وہ پہلو اور عنوان ہے جس کو دنیائے علم کے تمام اکابر و شہ سوار دانش مندی سے یاد فرماتے تھے۔

دارالعلوم کے قدیم نصابات میں معقولات کی درج بالا شاخوں کی تعلیم، ان ہی چند کتابوں پر ختم نہیں ہوجاتی تھی، جن کا تذکرہ ہوا، بلکہ جیسا کہ حضرت مولانا نانوتوی کے اس ارشاد سے جھلکتا ہے معقولات کے اورمباحث ومضامین بھی، مدرسہ کے نصاب اور مقاصد سے خارج نہیں تھے۔بعد کے دور میں اس میں چند شاخوں کا مزید اضافہ کیا گیا تھا، جس میں فلسفۂ جدید (مغربی فلسفہ) بھی شامل تھا۔جب علامہ رشید رضا مصری اواخر ربیع الثانی سنہ ۱۳۳۰ھ [۱۵/اپریل سنہ ۱۹۱۲ء] میں دارالعلوم دیوبند آئے تھے، اس وقت ذمہ داروں نے علامہ کو بتایا تھا کہ دارالعلوم میں جدید فلسفہ کی ابتدائی کتاب: "النقش کالحجر" نصاب میں شامل ہے، علامہ رشید رضا نے اس کتاب کے شامل نصاب کئے جانے پر خوشی کا اظہار کیا تھا، مگر اس موضوع پر اور کتابوں کے اضافہ کی بھی رائے دی تھی، جو اس سے زیادہ مفید ہوں۔علامہ کی تقریر کے اس حصہ کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

(۱) مؤتمر الانصار کی تشکیل دارالعلوم کے سب سے پہلے فارغین کا ایک منصوبہ یا ارادہ یہ تھا، جس کی ۱۲۹۵ھ میں ان طلبہ کی ذمہ داران مدرسہ کے نام ایک درخواست کی صورت میں ابتداء ہوئی تھی، مگر اس وقت اس کی علیحدہ ترتیب تشکیل نہیں ہوسکی تھی۔ اس واقعہ کے تقریباً تیس سال بعد شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن کی ہدایت پر، مولانا عبیداللہ سندھی نے رمضان المبارک سنہ ۱۳۲۷ھ (اکتوبر ۱۹۰۹ء) میں یہ تنظیم قائم فرمائی، اس وقت موجود تمام علمائے دیوبند اور فارغین دارالعلوم نے اس پر جوش لبیک کہی اور دلی مسرتوں کا اظہار کیا۔جب مؤتمر الانصار کے کام اور مقاصد کی ایک عملی صورت بن گئی، اس وقت اس کا پہلا اجلاس بلایا گیا۔جو ۱۵/تا ۱۷/ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ ۱۵/۱۷/اپریل سنہ ۱۹۱۱ کو مرادآباد میں منعقد ہوا تھا۔جس میں:

(۱) حضرت مولانا احمد حسن امروہوی (۲) مولانا حافظ احمد نانوتوی
(۳) مولانا حبیب الرحمان عثمانی (۴) مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی
(۵) حضرت مولانا اشرف علی تھانوی (۶) حضرت علامہ انور شاہ کشمیری
(۷) حضرت مولانا حسین احمد مدنی (۸) مولانا عبیداللہ سندھی
اور (۹) مولانا علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہم اللہ تعالیٰ

بطور خاص شامل تھے۔

مؤتمر الانصار کا غالباً سب سے بڑا مقصد یہی تھا کہ دارالعلوم دیوبند کو اسی قدیم طریقہ پر گامزن رکھا جائے، جو اس کے بانیان گرامی اور ان کے رفقائے کرام نے قائم کیا اور چھوڑا تھا۔تعلیم کے جن اصول اور طور وطریق میں مدرسہ اس پرانے راستہ سے کچھ دور ہوگیا ہے، اس کو اکابرین مدرسہ کے نظریات اور ہدایات وتعلیمات سے استفادہ کرتے ہوئے اسی راستہ پر لایا جائے، جس سے جدید وقدیم مدرسہ میں کچھ فرق معلوم نہ ہو۔جب وہی طریقہ اپنائیں گے اور وہی نظام تعلیم زندہ اور نافذ ہوگا تو، امید ہے کہ اس سے پھر ویسے ہی جامع افراد تیار ہوسکیں گے، جیسے پہلے دور میں ہوئے تھے، اور ان سے وہی فائدہ ہوگا جو اس وقت ہوا تھا۔تفصیلات کے لئے روداد، مؤتمر الانصار مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند

''ایک جماعت ہم میں ایسی بھی ہونی چاہئے جو ان شبہات کو رفع کرے، جو اسلام پر کئے جاتے ہیں، خصوصاً وہ شبہات جو موجودہ زمانہ کے علوم وفنون کی بناپر کئے جاتے ہیں مگر ایسے شبہات کا رفع کرنا، فلسفۂ جدید کی واقفیت کے بغیر ناممکن ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس جماعت کے اشخاص فلسفۂ جدید کے اہم مسائل سے واقفیت رکھتے ہوں۔

مجھے دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے اس سلسلہ کو شروع کیا ہے اور جدید فلسفہ کی ایک ابتدائی کتاب: ''النقش فی الحجر'' کو درس میں داخل کیا ہے، میرے نزدیک یہ کتاب ناکافی ہے، میں آپ کو ایسی کتابیں بتلاؤں گا جو اس سے زیادہ مفید ہوں گی (۱)

علامہ رشید رضا کی تقریر میں النقش کالحجر کے تذکرہ اور اس تقریر کی دارالعلوم کی روداد میں اشاعت کے بعد اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب: النقش کالحجر دارالعلوم کے نصاب میں شامل تھی مگر روداد سے اس کا تعارف نہیں ملتا، اس کے لئے اس کی کسی قدر تفصیل درج کی جاتی ہے۔

النقش فی الحجر علام طبعیہ کے تعارف اور ابتدائی اصول پر مشتمل ایک درسی کتاب ہے جو چھوٹے چھوٹے آٹھ حصوں پر مشتمل ہے۔ ان کے مندرجات ومضامین کی ترتیب یہ ہے:

حصہ اول: مبادی عامه فی الطبعیات	[طبعیات کے ابتدائی اصول	Elementry Principles of Physics
حصہ ثانی: الکیمیاء	[کیمسٹری	[CHEMISTRY
حصہ ثالث: الطبعیات	[طبعیات	[PHYSICS
حصہ رابع: الجغرافیة الطبعیه	[جغرافیۂ طبعی	[PHYSICAL GEOGRAPAHY
حصہ خامس: الجیولوجیا	[علم طبقات ارض	[GEOLOGY
حصہ سادس: الهیئة	[ہیئت/فلکیات	[ASTRONOMY
حصہ سابع: علم النباتات	[نباتات	[BOTANY
حصہ ثامن: اصول المنطق	[اصول منطق	[PRINCIPLES OF LOGIC

(۱) علامہ رشید رضا کی دیوبند آنے کی مختصر خبر، دارالعلوم دیوبند کی سنہ ۱۳۲۹ھ کی روداد میں درج کی گئی تھی اور مفصل رپورٹ جس میں استقبالیہ، سپاس نامہ، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی اصل عربی تقریر اور علامہ رشید رضا کی جوابی تقریر کا اردو ترجمہ شامل ہے، سنہ ۱۳۳۰ھ کی روداد میں درج ہے، تقریر کا عربی متن شریک اشاعت نہیں۔ ملاحظہ ہو: روداد سنہ ۱۳۳۰ھ ص: ۳۵ تا ص ۵۰ (جس میں نو صفحات کا ضمیمہ بھی ہے۔)

یہ کتاب مشہور امریکہ نژاد، مستشرق کرنیلوس فنڈ یک (CORNELIUS YANDYCE- پیدائش ۱۲۳۳ھ ۱۸۱۸ء۔ انتقال: ۱۳۱۳۔ ۱۸۹۵ء) کی تالیف ہے، جو عرب ممالک خصوصاً شام اور لبنان وغیرہ میں مغربی اقدار اور عیسائیت کی اشاعت کا رکن رکین، بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے بانیوں میں سے ایک، امریکن مشنریز کا عرب دنیا میں سب سے بڑا نمائندہ، متعصب پادری اور بائبل کا عربی مترجم بھی تھا۔ فنڈ یک کی ایک اور مشہور کتاب جو ہمارے مدارس کے نصاب میں شامل رہی اور غالباً اب بھی مولوی فاضل وغیرہ کے امتحانات میں ہے محیط الدائرہ ہے، جو عروض وقوافی کے موضوع پر ہے(۱)

اس کتاب کی دارالعلوم کے نصاب میں شمولیت پر غور کیجئے، تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگوں کی نگاہ میں، انگریز حکومت، انگریزی ثقافت وتہذیب، انگریزی زبان اوران کے علوم وفنون الگ الگ حیثیت رکھتے تھے۔ انگریز اورانگریزی ثقافت سے اختلاف اوراس کی تردید کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ ان کے علوم وفنون اور تعلیم کے بھی ایسے ہی مخالف وناقد تھے، اگرایسا ہوتا تو ہمارے حضرات خصوصاً حضرت شاہ محمد اسحاق اوراس دور کے اکابر وعلماء اس کی کھل کر مخالفت کرتے، اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے خاص شاگرد، مولانا رشیدالدین کشمیری دہلوی حضرت شاہ محمد اسحاق کے ایماء پر دلی کالج کی صدر مدرسی قبول نہ کرتے، حضرت مولانا مملوک العلی چھبیس سال تک دہلی کالج کے نائب صدرمدرس، پھر صدر مدرس نہ رہتے، اور یہ حقیقت کسی تحقیق کی محتاج نہیں کہ وہ تمام اکابر وعلماء جنہوں نے دارالعلوم ومظاہر علوم اوراس سلسلہ کے دوسرے مدارس قائم کئے تھے وہ سب دہلی کالج کے فیض یافتہ وپروردہ اورکم سے کم اس کے نصاب تعلیم اورطریقہ کار سے متاثر تھے۔ دہلی کالج سے واقف اصحاب جانتے ہیں کہ اس کالج میں ہراک مذہب کے فاضل اساتذہ کا اجتماع تھا اورتمام علوم وفنون بلاکسی تفریق کے پڑھائے جاتے تھے، اس سب کے باوجود ہمارے اکابراس کالج کے ہمیشہ مداح اورخود پراس کے اثرات واحسانات کے معترف رہے، راقم سطور کو معلوم نہیں کہ ان حضرات میں سے کسی نے دہلی کالج کی برائی یااس کے نظام کی تردید وتنقید فرمائی ہو۔

دہلی کالج کے اثر سے ان حضرات کی نگاہوں میں کس قدر وسعت اور ذہنوں میں کس قدر آفاقیت

---

(۱) فنڈ یک اورالنقش کالحجر کے تعارف کے لئے ملاحظہ ہو: اکتفاء القنوع بماھو مطبوع. تالیف اڈورڈ فنڈ یک۔ ص:۴۰۱/ ۴۰۳ (مطبع الہلال، مصر: ۱۳۱۳ھ ۱۸۹۶)

نیز الاعلام زرکلی ص: ۲۲۳ ج: ۵ (طبعۃ رابعہ، بیروت ۱۹۷۹ء)

گئی تھی اور وہ مغربی افکار ونظریات سے کس درجہ واقف رہنا چاہتے تھے اور رہتے تھے، اس کی متعدد مثالیں قریب کے دور تک موجود تھیں، یہاں حضرت مولانا مملوک العلی کے حوالہ سے صرف ایک اقتباس پڑھ لیجئے۔ دہلی کالج کے ایک مشہور طالب علم (مولوی) کریم الدین پانی پتی نے، اپنے استاد، مولانا مملوک العلی کے متعلق لکھا ہے:

''اور جس فن [یعنی مغرب کے ماہرین] کی کتاب اردو زبان میں انگریزی سے ترجمہ ہوتی ہے، اس کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا ذہن چسپاں ہو جاتا ہے، گویا اس فن کو اول ہی سے جانتے تھے''(۱)

النقش الحجر جیسی کتابوں کی دارالعلوم کے نصاب میں شمولیت و پذیرائی، اسی قدیم روایت کا ایک حصہ تھی۔ یہ اس وقت ہو رہا تھا جب دارالعلوم کی مسند حدیث حضرت شیخ الہند کی ذات گرامی سے باوقعت وعظمت تھی، تعلیمی نظام پر شیخ الہند کے نظریات کے اثرات واضح تھے، اس وقت دارالعلوم میں ایسی کتاب کا پڑھایا جانا جو مغربی نظام تعلیم کی نمائندہ اور مغربی اصول وفلسفہ کی ترجمان تھی ایک بڑی حقیقت کی پردہ کشائی کر رہی ہے، حالاں کہ سب جانتے ہیں کہ حضرت شیخ الہند برصغیر ہند میں مغربی استعمار اور انگریزیت کے شدید ترین مخالف تھے لیکن یہ حضرات تمام معاملات میں توازن واعتدال اور مناسب درجہ بندی کے قائل تھے، اور فرق مراتب کے ساتھ صحیح وغلط میں امتیاز فرماتے تھے، اس لئے انگریز کی سیاست سے نفرت اور اس کا ہر اک سطح پر مقابلہ اپنی جگہ اور اس کے علوم وفنون سے استفادہ اپنی جگہ! افسوس کہ اب یہ فکر اور وصف ہمارے یہاں سے تقریباً معدوم ہو گیا ہے۔

نیز علامہ رشید رضا نے اپنی تقریر میں النقش الحجر کے تذکرہ کے علاوہ اس اہم پہلو پر بھی توجہ دلائی تھی کہ ایسے شبہات کے اعتراضات کے جوابات کے لئے، جو ان علوم وفنون کی بناء پر کئے جاتے ہیں جو مغرب سے آرہے ہیں، فلسفہ جدید سے واقفیت نہایت ضروری ہے۔

علامہ رشید رضا کا یہ مشورہ، جو وقت کی ایک اہم ضرورت کے احساس اور گہرے مطالعہ وتجربہ پر مبنی تھا دیوبند کے لئے نیا نہیں تھا، یہ حضرات اس ضرورت سے اس سے بہت پہلے سے واقف تھے اور اس کے لئے ایک حد تک مناسب تدبیریں بھی فرما رہے تھے اس کی بھی ایک مثال ملاحظہ ہو:

(۱) طبقات الشعرائے ہند۔ کریم الدین پانی پتی ص: ۴۶۳ (عکس طبع اول ۱۸۴۷۔ لکھنؤ ۱۹۸۳ء)

اس دور میں دین وشریعت اور عقائد واحکام اسلامیہ پر، مغربی تعلیم یافتہ طبقہ خصوصاً عیسائیوں کی طرف سے جو اعتراضات کئے جاتے تھے، شام کے ایک بڑے عالم اور فلسفۂ اسلام ومغرب کے فاضل، شیخ حسین مصطفےٰ جسر نے، ان اعتراضات کے مغربی نظریات وفلسفہ کی روشنی میں، عمدہ اسلوب میں بہت فاضلانہ جوابات لکھے تھے، جس میں اسلامی احکامات کی افادیت اور حکمت ومعنویت کو اس طرح واضح کیا گیا تھا کہ عالم اسلام میں اس کتاب کی دھوم مچ گئی تھی۔ اس کتاب کا پورا نام:

الرسالة الحمیدیه فی حقیقة الدیانة الاسلامیه وحقیة الشرع المحمدیه

ہے، رسالہ حمیدیہ کے نام سے مشہور ہوئی اور ہندوستان بھی پہونچی، یہاں ہر طبقہ کے بڑے علماء اور اہل نظر نے اس کی خوب پذیرائی کی اور یہ کتاب متعدد مدارس اسلامیہ خصوصاً دارالعلوم کے اعلیٰ نصاب میں شامل کی گئی۔

اس کتاب کے عمدہ اسلوب تحریر اور نافعیت کی وجہ سے، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنے ایک ممتاز شاگرد اور جید عالم، مولانا محمد اسحاق بردوانی کانپوری سے اس کا اردو ترجمہ کرایا تھا، جو ''اسلام اور سائنس'' کے نام سے حضرت مولانا تھانوی کی توجہ اور اہتمام سے شائع ہوا تھا اور اپنے موضوع پر حددرجہ مفید کتابوں میں شمار کیا گیا۔ حضرت مولانا تھانوی نے اس ترجمہ کو حرفاً حرفاً دیکھا اور درست کیا تھا اور اس پر تقریظ لکھی تھی، جس میں تحریر ہے کہ:

''مدت سے یوں دل چاہتا تھا کہ کوئی ایسی کتاب جمع کی جاوے جس سے ان خیالات کی اصلاح ہو، جو بوجہ ناواقفیت علوم دینیہ کے بعض نوجوانوں کو تعلیم فلسفۂ جدیدہ سے اسلامی فروع واصول میں پیدا ہو گئے، اسی اثناء میں ایک کتاب حمیدیہ نام نظر سے گزری، جو اس غرض کی تکمیل کے لئے کافی ووافی ثابت ہوئی''

(۱) شیخ حسین بن محمد بن مصطفیٰ الجسر۔ طرابلس شام کے رہنے والے تھے سنہ ۱۲۶۱ھ ۱۸۴۵ء میں ولادت ہوئی، اپنے علاقہ کے اپنے دور کے ممتاز اصحاب علم وفضل میں تھے۔ سنہ ۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء میں طرابلس میں وفات ہوئی۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے جس میں رسالہ حمیدیہ بہت مشہور اور مفید ترین تالیف ہے۔ مزید معلومات کے لئے دیکھئے: الاعلام، خیرالدین زرکلی۔ ص:۲۵۸ ج:۲۔ (بیروت:۱۹۷۹ء)

(۲) رسالہ حمیدیہ سلطان عبدالحمید خاں امیرالمؤمنین، والی ترکی سے منسوب ہے، پہلی مرتبہ سنہ ۱۳۰۶ھ (۸۹۔۱۸۸۷) میں شائع ہوا تھا، اس طباعت کا ایڈورفنڈیک نے اکتفاء القنوع بما ھو مطبوع (طبع اول ۱۳۱۳ھ۔ ۱۸۹۶ء) میں ذکر کیا ہے ص:۵۱۴۔ رسالہ حمیدیہ کی پہلی طباعت، مطبوعہ مجلس معارف، بیروت کا ایک عمدہ نسخہ ہمارے ذخیرہ میں موجود ہے۔

اس تحریر کے آخر میں فرماتے ہیں:

"اب خداتعالیٰ سے یہ دعا ہے کہ یہ ترجمہ چھپ جاوے اور ہر طالب علم عربی وانگریزی مدارس کا اس سے منتفع ہو اور ان سب کے لئے یہ سرمایہ ہدایت واہتداء ہو۔ آمین۔"

درج بالا تفصیلات سے واضح ہے کہ قدیم مدارس اسلامیہ خصوصاً دارالعلوم اور مظاہر میں ان کے آغاز کے وقت سے ہی، قدیم صالح کے ساتھ جدید نافع کا امتزاج تقریباً پچاس سال تک نہ صرف جاری رہا، بلکہ ہر دور میں اس میں نئے اور مفید اضافے بھی ہوتے رہے۔ یہ روایت غالباً سنہ ۱۳۳۳/۱۹۱۴ء سے کمزور ہونی شروع ہوئی، جب خلافت اسلامیہ پر انگریزوں کی یلغار کے سبب، مغربی افکار وعلوم سے نفرت کا سبق دیا گیا اور ان کو نصاب سے نکال دینے کی تجویزیں سامنے آئیں، افسوس کہ ان تجویزوں پر عمل بھی ہوا۔ اسی کا اثر تھا کہ مدارس اسلامیہ کے نصاب اور معمول میں منطق وفلسفہ کی طویل طویل (غیر ضروری) کتابوں کے اضافہ کی حوصلہ افزائی کی گئی لیکن معقولات کی دوسری شاخیں، علوم اور مفید مباحث نصاب درس سے غائب اور مفقود ہوتے چلے گئے، یہاں تک یہ کیفیت ہوئی اور وہ وقت آیا کہ ان موضوعات اور کتابوں کی تعلیم وتدریس مدارس عالیہ کے مقاصد بلکہ بعض حلقوں میں دین کے بھی خلاف سمجھ لی گئی، جو ظاہر ہے کہ اسلام کی بارہ سوسالہ علمی تعلیمی روایات اسلاف کے اسوہ اور تمتع زہر گوشہ یافتم کے نظریہ کے خلاف ہے۔

منطق وفلسفہ کے علاوہ اور عقلی موضوعات کو مدارس کے تعلیم نصاب خارج کرنے کا عمل، غالباً سنہ ۱۳۳۳ھ کے قریب شروع ہوگیا تھا، اختتام کی تاریخ مجھے معلوم نہیں مگر مظاہر علوم میں ان میں سے بعض علوم

(۱) مولانا محمد اسحاق بن لطف الہدی، بردوانی، بنگالی۔ سنہ ۱۲۸۳ھ میں ولادت ہوئی، اپنے علاقہ کے علماء سے اور آرا بہار میں ابتدائی کتابیں پڑھیں، پھر کان پور آئے یہاں مولانا اشرف علی تھانوی سے درسیات مکمل کیں۔ تعلیم سے تکمیل کے بعد مدرسہ جامعہ العلوم کانپور میں مدرس ہوئے۔ لمبے عرصہ تک وہاں پڑھایا، پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ میں استاد مقرر کئے گئے، پھر ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسر نامزد ہوئے۔ کئی کتابوں کے مصنف ومترجم تھے، سنہ ۱۳۵۷ھ میں کلکتہ میں وفات ہوئی، وطن میں دفن کئے گئے۔ نزہۃ الخواطر ص: ۵۲۔۵۱ ج: ۸۔

(۲) سائنس اور اسلام، ذی قعدہ ۱۳۱۷ھ مارچ ۱۹۰۰ء میں امیر احمد تھانوی کے اہتمام سے مطبع روزانہ اخبار، دہلی سے پہلی مرتبہ چھپی تھی۔ یہ اشاعت بڑے سائز کے دوسو پچانوے صفحات پر مشتمل ہے [اس طباعت کا بھی ایک نسخہ ہمارے ذخیرہ میں ہے]

(۳) سائنس اور اسلام ص: ۲۹۶، تقریظ مکتوبہ ۱۸/رجب ۱۳۱۵ھ

وفنون، جزوی انفرادی طور پر سنہ ۱۳۸۰ھ/۱۹۶۰ء تک پڑھائے گئے تھے، اس کے بعد وہاں بھی ان کا چراغ گل ہوگیا۔ سدا نام رہے اللہ کا!

ان معلومات وتفصیلات کی روشنی میں غور فرمایئے کہ کیا اس طریقہ پر عمل اور اس کی صحیح ترتیب وتکمیل کو اپنے بزرگوں کی صحیح پیروی اور نمائندگی قرار دیا جائے گا، جس کا انہوں نے ان مدارس کے آغاز کے وقت ارادہ واعلان فرمایا تھا اور جس پر خود حضرات اکابر بلکہ ان کے بعد کی دو تین نسلیں پچاس سال تک عامل وکاربند رہیں، یا ان ترمیمات واصول کو، جو ان قافلہ سالارانِ علم وصلاح کی دنیا سے رخصت کے برسوں کے بعد روبہ عمل آئے؟ سلف کی تقلید واتباع اس کو قرار دیا جائے گا یا اس کو، دینی علمی نفع اس میں زیادہ تھا یا اس میں؟

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا......؟

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقلی علوم وموضوعات کی دینی اداروں سے خانہ بدری کے عمل اور اس تغیر وانقلاب میں، دو محرکات خاص طور سے دخیل وکارفرما رہے:

ان تمام بزرگوں کی وفات جنہوں نے یہ مدارس قائم کئے تھے۔ یہ حضرات وہ تھے جنہوں نے سنہ ۱۸۵۷ء میں دہلی میں قلعہ معلّٰی کی حکمرانی اور مغل حکومت کی آخری ٹمٹماتی جھلک دیکھی تھی، پھر سنہ ۱۸۵۷ء کے خوں آشام ہولناک انقلاب کا بھی نظارہ کیا اور اس کے نتیجہ میں برصغیر کے مسلمان جس طرح بے حیثیت اور گرد کارواں بن کر رہ گئے تھے، اس کا بھی بہت قریب سے مشاہدہ کیا تھا، اور حکومت برطانیہ کے استحکام سے، یہاں کے نظام تعلیم ومعاشرت پر جو اثرات پڑ رہے تھے، اس کا بھی یہ حضرات پوری بصیرت اور دانائی کے ساتھ مطالعہ کر رہے تھے۔ اسی تأسف اور نقصان کے غیر معمولی ادراک واحساس نے ان حضرات کو یہ مدارس قائم کرنے پر آمادہ کیا تھا، ان حضرات کی بلند نگاہوں اور عالی فکر نے اس کا احساس فرمالیا تھا کہ اب اس امتزاج کی، جس کا ہم نے حضرت مولانا مملوک العلی کے حلقۂ تلمذ اور دہلی کالج کے زمانہ تعلیم میں تجربہ اور استفادہ کیا تھا، پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ اس لئے ان حضرات نے علوم دینیہ کی خدمت اور احیائے اشاعت اسلام کو اصل اصول اور مینارۂ نور قرار دیتے ہوئے، اپنے مدرسوں کے لئے جو نصاب تعلیم تجویز فرمایا تھا اس میں

(۱) دہلی کالج اور مولانا مملوک العلی نانوتوی کے فیض یافتہ اصحاب میں سے، ان مدارس میں آخری بڑے عالم، شیخ الہند کے والد ماجد، مولانا ذوالفقار علی......وفات ۱۵رجب ۱۳۲۲ھ (ستمبر ۱۹۰۴ء) تھے۔

ایسے عقلی علوم کی آمیزش اور چاشنی بھی شامل فرمائی تھی، جن کو آج کل مغربی علوم کہا جاتا ہے۔ ان بزرگوں سے بہتر اس کا اندازہ کس کو ہو سکتا تھا کہ یہ علوم جو ذہن کی جلاء، وقت کے تقاضوں کی تکمیل اور ان کی تفہیم و تحقیق کے لئے بے حد ضروری ہیں۔

ممکن تھا کہ جدید علوم سے استفادہ اور ان کے دائرۂ علم کی مدارس میں شمولیت کا عمل، علامہ رشید رضا کے سفر ہند اور مشوروں کے بعد آگے بڑھتا اور اس میں کچھ نئے موضوعات و مضامین شامل ہوتے کہ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ـ۱۹۱۷) شروع ہو گئی، جس میں خلافت اسلامیہ (ترکی) جرمنی کے علاوہ، تمام مغربی ملکوں کی یلغار کا نشانہ بنی۔ اس جنگ کے مقاصد اور لمبے سازشی منصوبوں کے سامنے آنے کے بعد مغربی ملکوں کا خلافت ترکی کے خلاف خصوصاً اور تمام مسلم ملکوں کے خلاف عموماً جو خونخوار چہرہ سامنے آیا اور ان ملکوں خصوصاً برطانیہ کے ہاتھوں مسلمانوں کی حرمت و آبرو جس طرح پامال ہوئی، اس سے پوری مسلم دنیا میں انگریزوں کے خلاف شورش بھڑکنا اور آگ سی لگ جانا بالکل فطری بات تھی۔ برصغیر ہند کے مسلمان بھی جو عالم اسلام کے نظام کا ایک بڑا حصہ ہیں، بجا طور پر اس سے بے حد متاثر ہوئے اور یہاں بھی انگریزی استعمار اور مغرب کے ظلم و ستم اور سیاسی جنگی منصوبوں کے خلاف بلند اور طاقتور آوازیں اٹھنی شروع ہو گئیں، جنہوں نے جلد ہی ملک گیر تحریکات کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تحریک خلافت، ریشمی رومال تحریک، تحریک ہجرت، تحریک خدام کعبہ وغیرہ تنظیمیں اور تحریکات اسی کا ردعمل اور اسی جدوجہد کا ایک حصہ تھیں، انہی تحریکوں کے اثر سے مسلمانوں نے کانگریس پارٹی کے ساتھ تعاون کا ہاتھ بڑھایا جہاں سے بات بڑھتے بڑھتے انگریز کے خلاف عدم تعاون (Non'Co' Operation) تک پہنچی، مختلف تحریکات کے ایک حصہ یا احتجاج کے طور پر انگریزوں کے خلاف اور بھی کئی پہلوؤں سے اظہار ملامت و نفرت کیا گیا تھا، اسی میں ایک [ناپسندیدہ] عنصر یہ بھی شامل ہو گیا کہ یہ نفرت انگریز کے سیاسی نظام اور استعمار کے سیاسی نظام تک محدود نہ رہ کر، ان سب چیزوں اور مباحث و موضوعات و ایجادات و مستعملات تک پہنچ گئی تھی جن کا مغرب خصوصاً برطانیہ کے تعلیمی اداروں، علوم و فنون اور کارخانوں سے کسی طرح کا بھی کچھ تعلق تھا یا جس کی وہاں تعلیم تحقیق اور تشکیل ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس ملک گیر وسیع اور ردعمل سے برصغیر کے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ بے حد متاثر ہوا، اور اس نے سیاسی تحریک میں شدت لانے کے لئے یا فرط جذبات میں، ایسے موضوعات و مضامین کو بھی جو اگرچہ پرانے زمانہ سے

مدارس کے نصاب میں بھی شامل تھے۔ لیکن کالجوں یونیورسٹیوں میں بھی اہتمام سے پڑھائے جاتے تھے، اسی انگریزی نظام وسیاست کا ایک حصہ سمجھ لیا، اوران سب کو انگریز دشمنی میں ایک ایک کر کے، دینی نظام تعلیم یا مدارس سے خارج کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا، بالآخر وہ وقت آیا کہ ان سب ہی کی تعلیم فضول اور ناپسندیدہ قرار پائی۔ یوں ہم ان تمام علوم وفنون، مباحث وموضوعات سے محروم ہو گئے جن کو موجودہ بلند مقام تک پہنچانے میں امت کے بے شمار اعلیٰ دماغ اور بارہ سو سال کی محنت صرف ہوئی تھی، حالاں کہ ان علوم اور مغربی سیاسی نظام کا کوئی باہمی رشتہ نہ تھا، یہ تو ایک تحقیق ایک تجربہ اور جدوجہد ہے، جو اس میں لگے گا دنیاوی ترقیات کی منزلیں طے کرے گا، ایجادات ومعاش میں آگے بڑھے گا اور نظام عالم پر اپنی گرفت مضبوط کرے گا۔

یہ ایک سانحہ اور المیہ ہی ہے کہ وہ تمام علوم وفنون، جن کو اب ہم نے اپنے دینی ملی ورثہ سے خارج کر کے مغرب کے سرمایہ علم کا حصہ سمجھ لیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے عہد تک، نہ صرف عالم اسلام بلکہ برصغیر ہند میں بھی، اکثر مدارس کے نصابات اور تعلیمی نظام کا ایک خاص جز شمار کئے جاتے تھے۔ تاریخ کے اوراق کی معمولی ورق گردانی کرنے والے بھی جانتے ہیں کہ یہ تمام علوم ومباحث جن کو ہم پتہ نہیں کیوں مغربی علوم کہتے ہیں، ہمارے مدارس، خانقاہوں بلکہ مساجد تک میں پڑھائے جاتے تھے۔ علمائے کرام انفرادی اجتماعی طور پر ان کا درس دیتے اور اپنے شاگردوں کو ان میں ایسا ماہر ومشاق بنادیتے تھے کہ کئی مرتبہ مغربی ماہرین کو بھی ان کی لیاقت وصلاحیت پر رشک آتا تھا اور وہ بھی ان کو اپنے طرۂ کمال میں ٹانکنے کے لئے تیار بلکہ بے تاب وبے قرار ہو جاتے تھے۔

اور یہ بھی ایک دردناک تاریخی حقیقت ہے کہ درج بالا عقلی علوم وفنون میں سے کئی ایسے ہیں کہ جب ان کو ہمارے مدارس نے اپنے حلقۂ درس سے خارج کر دیا، تو ان کی افادیت کی وجہ سے، کالجوں نے اپنے نصاب میں ان کا زیادہ اہتمام شروع کر دیا، جس کے اثر سے دنیا کے ظاہری مفادات کی ترازو میں ہمارا وزن کم اور ہلکا ہوتا اور ان کا اسی تناسب سے بڑھتا چلا گیا۔

اور یہ بھی ایک عالم آشکارا حقیقت ہے کہ ہمارے مشرقی حلقوں اور اداروں میں، جن علوم ومباحث کو مغرب کا خاص تحفہ اور میراث سمجھا جاتا ہے کہ ان کی پرورش اور تزئین وآرائش، مسلم ملکوں اور قدیم اسلامی مشرقی درس گاہوں میں ہوئی تھی مغربی افراد اور تعلیمی اداروں نے اپنے اکثر علوم اور نظریات ان ہی مسلم

ملکوں، علماء اور اداروں سے حاصل کئے تھے پھر ان کو ترقی دی آگے بڑھایا اور ان میں مسلسل محنت کر کے ان کو اپنا اختصاص اور سرمایۂ ناز بنالیا۔ جب ہم نے ان سے اپنا دامن جھٹک لیا تو ان لوگوں نے ان پر محنت اور ان کی سرپرستی کی جو نظام عالم پر اپنی برتری چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے ان علوم کو درجہ کمال تک پہنچا کر آسمان میں کمندیں ڈال دیں، ایک ہم ہیں کہ:

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

امید کہ ان معروضات کی روشنی میں اکابر کے طریقہ کے مطابق قدیم خالص اور جدید نافع کے امتزاج کو عمل میں لانے کی کوششیں پھر تازہ ہوں گی اور

کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد

والانامہ

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدفیوضہ

Justice Mohammad Taqi Usmani
Ex Member Shariat Appellate Bench
Supreme Court Of Pakistan.
Darul Uloom
Karachi-75180
Pakistan.
Phones: Office # 504-3192
Res. Direct: 504-5337
Res. PABX: 50-2705 Ext. 308
Fax: 92-21-504-0234

محمد تقي العثماني
قاضي مجلس التمييز الشرعي للمحكمة العليا باكستان سابقاً
نائب رئيس، مجمع الفقه الإسلامي بجدة
نائب رئيس، دار العلوم كراتشي ١٤ باكستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

برادر گرامی قدر و مکرم جناب مولانا نور الحسن راشد صاحب زید کرمکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آپ کا گرامی نامہ اور اس کے ساتھ آپکی تصنیف لطیف "حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح اور حضرت گنگوہی قدس سرہ کا فتوی بسلسلۂ شرعی حیثیت ہندوستان" موصول ہوا۔ اللہ تعالی نے آپ کو اکابر کے حالات و افادات کو ہم جیسوں کی رہنمائی کیلئے عام کرنے کی خاص توفیق عطا فرمائی ہے، چنانچہ یہ تالیفات بھی اسی کا مظہر ہیں، اپنی مصروفیات کے ہجوم کے باوجود تذکرۂ حضرت مولانا محمد مظہر نانوتویؒ کا ایک معتد بہ حصہ پڑھکر استفادہ کا موقع ملا۔ جزاکم اللہ تعالی۔

جہاں تک حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے فتاوی کا تعلق ہے، مجھے تو ایسا یاد پڑتا ہے کہ میں اسکے بارے میں اپنی معروضات آپ کو لکھکر بھیج چکا ہوں، لیکن آپ کے حالیہ خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ تک نہیں پہنچیں۔ چونکہ یہ احتمال ہے کہ آپ کے حالیہ خط سے پہلے نہ پہنچی ہوں، بعد میں پہنچ گئی ہوں، اسلئے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ اگر پہنچ گئی ہوں تو خیر، ورنہ براہ کرم دوبارہ مطلع فرمائیں، تاکہ دوبارہ کچھ لکھدوں، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ بندہ کو لکھنے کی حاجت نہیں ہے، آپ ویسے ہی شائع فرما سکتے ہیں۔

والسلام

بندہ

[signature]

۱۲-۸-۱۴۲۸ھ

وقت است کہ بکشایم میخانۂ رومی باز پیران حرم دیدم در صحنِ گلستاں مست

پیر رومی مرشد روشن ضمیر کاروان عشق و مستی را امیر

مولانائے رومؒ اوران کی مثنوی معنوی

ہندوستان میں اس کا فیضان و پیغام، شرح و تحقیق اور تعلیم و اشاعت

نیز

تکملہ یا اختتام مثنوی، از حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ

چند پہلو اور معلومات

حضرت مولانا جلال الدین (محمد بن محمد) قونوی رومی اوران کی مثنوی معنوی، اس کا پیغام، اس کی افادیت ومعنویت، اس کی بے پناہ تاثیر اور عالم اسلام کے سفر معرفت میں اس کا حصہ، کسی تعارف کا محتاج نہیں۔

برصغیر ہند کے مختلف روحانی حلقوں نقشبندیہ چشتیہ کے عالی مرتبت مشائخ کا اس سے گہرا شغف، اس کے درس کا اہتمام، اس کے نکات اوراس کے مباحث کی وضاحت وتوجیہ کی کوششیں، خصوصاً آخری دور میں حضرت شاہ ولی اللہؒ اوران کے صاحبزادگان گرامیؒ کی مثنوی سے وابستگی حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی محفل میں اس کے درس وتعلیم کا غیر معمولی اہتمام، حضرت حاجی صاحب کا مفتی الٰہی بخش سے سلسلہ اُجازت، حضرت حاجی صاحب کے مثنوی پر فاضلانہ حاشیے اور مثنوی مولانا روم کواس کے شایان شان چھپوانے کی تمنا، اور حاجی صاحب کی ہدایات کی روشنی میں مثنوی کی مولانا احمد حسن پنجابی کانپوری، کے اہتمام سے کان پور سے بے نظیر اشاعت، اوران سب کے علاوہ دلدادگان مثنوی اور اور اہل قلب ومعرفت کے لئے ہندوستان کا خاص تحفہ

تکملہ یا اختتام مثنوی تالیف: عارف کامل، حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ

اس تکملہ کی اہل علم وعرفان کی محفلوں میں پذیرائی، اس کے قلمی مطبوعہ نسخے، ترجمے، حاشیے اور متعلقات پر مقالات ومضامین اور ضروری اطلاعات۔ یعنی مثنوی مولانا روم اوراس کے تکملہ کے لئے علمی معنوی تاریخی ادبی گوشوں اور متعلقات پر اہل علم ونظر اور ارباب فکر وتحقیق کے تاثرات وتحقیقات کا خلاصہ تصانیف ومقالات کا مجموعہ۔

یہ خاص اشاعت تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہوگی تفصیلات کا انتظار فرمائیے۔

ان خوفناک لمحوں کی روداد، جب تاریخ ایک کروٹ لے رہی تھی

معرکۂ شاملی وتھانہ بھون، سنہ ۱۸۵۷ء

تالیف

نورالحسن راشد کاندھلوی

سنہ ۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون اور شاملی میں کیا ہوا تھا، اس کی حقیقت کیا ہے اس کا دائرہ کس قدر وسیع تھا، اس میں کون کون اصحاب شریک تھے، کون ذمہ دار اور سربراہ تھا، کب اور کہاں معرکہ آرائی ہوئی، کس جگہ کون کامیاب ہوا، کس نے کہاں پسپائی اختیار کی، اور بعد میں اس کی کیا قیمت ادا کرنی پڑی۔ بعض تذکرہ نگاروں نے حالات کے جبر سے، بعض ناواقفیت سے اور کچھ نے فرط جذبات میں واقعات کو کچھ سے کچھ بنادیا، جس کی وجہ سے تاریخ کے اس عنوان کے متعلق طرح طرح کے اعتراضات وسوالات پیدا ہوگئے۔ اس تالیف میں اس کی امکانی حد تک معتبر مستند روداد، خصوصاً اہل علاقہ اور اہل معاملہ کی تحریرات، انگریزوں کے اندراجات واعترافات پیش کئے جارہے ہیں۔

حضرت حافظ محمد ضامن شہید اور حضرت حاجی امداد اللہ [امداد حسین] کی شہادت وشرکت کی، انگریز افسران اور سرکاری دستاویزات کے حوالہ سے تصدیق، اوران تشنگان راہ خدا کا تذکرہ:

جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

نیز پچاسوں اشخاص کے نام ولدیت کی صراحت کے ساتھ، جنہوں نے اس معرکہ میں حصہ لیا اور اس کی پاداش میں سزائے موت پائی، مفرور اور لائق گردن زدنی، یا سخت سزاؤں کے مستحق قرار دئے گئے۔

امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اس میں اس سلسلہ کی وہ تمام معلومات وتفصیلات ہوں گی جن کی اس موضوع کے شائقین کو ہمیشہ تلاش رہی اور جن کے بغیر اس عنوان کو مکمل اور لائق اعتماد نہیں کہا جاسکتا۔

ایک مستند تاریخ، ایک معتبر دستاویز ایک لائق مطالعہ تحریر

ڈیمائی سائز کے تین سو سے زائد صفحات۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی اشاعت متوقع ہے۔

ناشر

[حضرت] مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ، ضلع مظفر نگر، یوپی ہند

لائق مطالعہ چند نئی مطبوعات

العرف الوردی فی اخبار المہدی تالیف: امام جلال الدین سیوطیؒ

حضرت مہدی کے ظاہر ہونے اور متعلقہ پیشین گوئیوں پر مبنی احادیث شریفہ کا ایک بڑا مجموعہ اور انتخاب عربی کے عمدہ خوبصورت قلمی نسخہ کا اعلیٰ درجہ کا فوٹو عمدہ کاغذ وطباعت، دیدہ زیب خوش رنگ ٹائٹل، قیمت صرف ۴۵ روپے

سیرت خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم تالیف: علامہ محب الدین طبری مکیؒ

ترجمہ از مفتی اعظم، مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ تکمیل ترجمہ مولانا اظہار الحسن صاحب کاندھلویؒ

ساتویں صدی کے ممتاز مصنف محدث، اور مؤرخ علامہ محب الدین طبری مکی کی سیرت پاک پر مشہور تالیف "خلاصة سیر فی سیرت خیر البشر ﷺ" کا اردو ترجمہ جس میں سیرت پاک کے متعلق ایسی متعدد معلومات میں جو اکثر کتابوں میں بھی آسانی سے نہیں ملتی۔ یہ کتاب بڑے بچوں عورتوں اور کم پڑھے لکھوں سب کے لئے مفید ہے۔ عمدہ کتابت وطباعت، اٹھانوے صفحات۔ قیمت صرف چالیس روپے

فضیلت قرآن ترجمہ فضل القرآن فارسی

تالیف: حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ ترجمہ وحواشی: نور الحسن راشد کاندھلوی

قرآن پاک کے فضائل اور مختلف سورتوں کے متعلق احادیث شریفہ اور تلاوت قرآن شریف کے ضروری مسائل پر اپنے موضوع کی بہت جامع اور مختصر تالیف ہے۔ جو ہر ایک کے مطالعہ کے لائق اور نہایت مفید و مؤثر ہے۔

قیمت صرف پچیس روپے

رسائل اصول حدیث (عربی فارسی مع اردو ترجمہ)

تالیف: حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ ترجمہ: نور الحسن راشد کاندھلوی

اصول حدیث کا جامع منتخب اور واضح تذکرہ، جو ایک عرصہ تک متعدد دینی مدرسوں کے نصاب میں شامل رہا۔ اس کو حضرت مولانا تھانویؒ اور مولانا خیر محمد جالندھریؒ نے بھی شائع کرایا تھا۔ خوبصورت ٹائٹل۔ عمدہ طباعت۔

قیمت صرف پچیس روپے

مختصر تذکرہ حضرت مفتی الٰہی بخش نشاط کاندھلوی تالیف نور الحسن راشد کاندھلوی

حضرت مفتی الٰہی بخش حضرت شاہ عبد العزیز کے سب سے پہلے اور منتخب ترین شاگردوں اور اپنے عہد کے ممتاز ترین علماء اور اہل درس وافادہ بزرگوں میں سے ہیں اور کاندھلہ کے مشہور وممتاز علماء کے جد امجد ہیں۔ کاندھلہ کے مشائخ وعلماء کے خاندانی پس منظر اور حضرت مفتی صاحب کی خدمات وتصانیف سے واقفیت کے لئے اس کتاب کا مطالعہ لازمی ہے۔ صفحات قیمت صرف چالیس روپے